معارف

فروری ۲۰۱۵ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

(اوپر کی رقوم ہندوستانی روپئے میں دی گئی ہیں)

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

سجاد الٰہی صاحب، 27-A لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور (پاکستان)

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۵ ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۱۵ء عدد ۲

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

گستاخانہ خاکوں کو شائع کرنے والے اخبار چارلی ہیبڈو کے آفس پر حملہ کی صحیح تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔اس کے لیے ذمہ دار بتائے جانے والے افراد اپنا نقطۂ نظر بتانے کے لیے موجود نہیں رہے۔ابتدا ہی سے اس کے تعلق سے ایسے سوالات اٹھنے شروع ہوگئے تھے جن سے واضح تھا کہ واقعہ کی اصل صورت وہ نہیں ہے جو پیش کی جارہی ہے۔اب خود یوروپ میں اس کی صحت پر سوال اٹھنے شروع ہوگئے ہیں۔اب جو تصویر ابھر کر سامنے آرہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا واقعہ ایک منصوبہ بند سازش کا حصہ تھا جو یوروپ میں اسلام دشمنی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو تقویت پہنچانے کے لیے انجام دیا گیا۔اس مقصد میں بڑی کامیابی بھی ملی۔ ۱۱رجنوری کو پیرس میں ملین مارچ کے موقع پر لاکھوں لوگوں کی طرف سے یہ نعرہ کہ ''میں چارلی ہوں'' اور اس رسالہ کی فروخت میں غیر معمولی اضافہ اس کا واضح ثبوت ہے۔اس کے علاوہ ادھر کچھ دنوں سے مختلف اسباب کے زیر اثر فلسطین کے سلسلہ میں یوروپ کے رویہ میں واضح تبدیلی کے آثار نظر آرہے تھے۔امریکہ اور اسرائیل ہر قیمت پر اس رجحان کو روکنا چاہتے ہیں۔اس قسم کے واقعات سے اس مہم میں بہت مدد مل سکتی ہے،فرانس کے صدر اور جرمنی کی چانسلر کے بیانات سے یہ واضح ہے کہ یہ پہلو ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔

ان گستاخانہ خاکوں کے خلاف دنیا بھر میں مسلمانوں نے شدید غم وغصہ کا اظہار کیا۔کئی ممالک میں بڑے پیمانے پر مظاہرے ہوئے۔بعض حکومتوں کی طرف سے سخت ردعمل بھی سامنے آیا۔اس کے باوجود اتنی بڑی اسلامی دنیا سے حکومتی سطح پر ایسے سنگین واقعہ کا جو ردعمل سامنے آیا ہے وہ مایوس کن اور افسوس ناک ہی نہیں حد درجہ شرم ناک بھی ہے۔یہ رسالہ گذشتہ کئی برسوں سے اس گھناؤنے جرم میں مصروف ہے اور مغربی دنیا نے نام نہاد آزادی رائے کے نام پر اس کو اس کی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔اس کی سنگینی اور غیر معمولی شناخت کے باوجود اسلامی دنیا اس سلسلہ میں کوئی متحدہ اور سخت موقف اختیار کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔اگر عالم اسلام نے ابتدا ہی میں اصولی،متفقہ اور سخت موقف اختیار کیا ہوتا اور دوٹوک الفاظ میں یہ پیغام دے دیا گیا ہوتا کہ یہ صورت حال یکسر ناقابل قبول اور ناقابل برداشت ہے تو آزادی رائے کے ان نام نہاد علم برداروں نے جس طرح بعض دوسرے امور اور معاملات کو آزادی رائے کے دائرہ سے باہر رکھ چھوڑا ہے اس معاملہ میں بھی کوئی حکمت عملی وضع کرنے پر مجبور ہوتے۔پورے عالم اسلام کی متفقہ اور پرزور آواز کو نظر انداز کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔واقعہ یہ ہے کہ مغربی ممالک جس مطلق آزادی رائے کی بات کرتے ہیں اس پر وہ خود بھی یقین

نہیں رکھتے اوراس سلسلہ میں دوہری پالیسی کے مجرم ہیں۔ابھی کچھ ہی دن پہلے اسی اخبار نے اپنے ایک صحافی Maurice Sinet کواس جرم میں ملازمت سے سبک دوش کردیا کہ اس نے سابق فرانسیسی صدر نکولس سرکوزی کے بیٹے کا مضحکہ اڑایا تھا جس نے ایک مال دار یہودی خاتون سے شادی کی تھی۔اسی فرانس میں مسلم خواتین کو حجاب کے استعمال کی آزادی نہیں ہے۔ملین مارچ میں جرمنی کی خاتون چانسلر بھی شریک تھیں جن کے ملک میں ہولوکاسٹ کا انکار قابل تعزیر جرم ہے۔ہولوکاسٹ کا تعلق کسی مذہبی عقیدہ سے نہیں ہے بلکہ یہ دور حاضر کا ایک تاریخی واقعہ ہے جس کے بارے میں محققین کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ دستیاب شواہد کی روشنی میں کوئی رائے قائم کرسکیں،لیکن آزادی رائے کے یہ علم بردار اس تاریخی واقعہ کی ایک مخصوص تعبیر پر اصرار کرتے ہیں اور اس سے اختلاف کرنے والوں کو سزا دیتے ہیں۔اس کے باوجود آزادی رائے کے بلند بانگ دعووں پر کوئی حرف نہیں آتا۔اس ملین مارچ میں اسرائیل کا بدنام زمانہ وزیر اعظم بھی شریک تھا جس نے فلسطین کے مظلوم اور نہتے عوام کے خلاف ظلم و جبر کی ایک نئی تاریخ رقم کی ہے اور اس کی حکومت نے صرف ۲۰۱۴ء میں آزادی رائے کے اظہار کے جرم میں سات صحافیوں کو موت کی نیند سلادیا اور کہیں سے اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھی۔یہ عجیب آزادی رائے بھی ہے جس کا مقصد صرف مسلمانوں کی دل آزاری ہے۔سچ ہے: ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

جہاں تک چارلی ہیبڈو کا تعلق ہے تو وہ گذشتہ کئی برسوں سے صہیونیت کا آلہ کار اور ترجمان بن چکا تھا۔اس سے قطع نظر یہ وقت کی ضرورت ہے کہ مغرب میں موج زن اسلام دشمنی کے پیچھے کارفرما عوامل کا گہرائی اور باریک بینی سے تجزیہ کیا جائے اور اس کے سدباب کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں۔واقعہ یہ ہے کہ اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود اہل مغرب ابھی صلیبی جنگوں کے اثرات بد سے آزاد نہیں ہوسکے ہیں۔صدیوں تک اسلام کے خلاف نفرت اور عداوت کی مہم اتنی شدت اور منصوبہ بند طریقے سے چلائی گئی ہے کہ وہ اہل مغرب کی سائیکی کا حصہ بن چکی ہے۔مزید براں اس کو تقویت پہنچانے والے عوامل مسلسل بروئے کار آتے رہتے ہیں۔ عالمی میڈیا کا بڑا حصہ یا تو یہودیوں کی ملکیت ہے یا ان کے زیر اثر ہے۔اسلام دشمنی یہودیت کی سرشت میں شامل ہے جیسا کہ خود قرآن مجید کی گواہی موجود ہے۔مسئلہ فلسطین نے اس کی حساسیت میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ دنیا میں مغربی تہذیب کے مکمل غلبہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہے۔مغرب جس نظام اقدار کو دنیا میں نافذ اور غالب کرنا چاہتا ہے اس کی راہ میں سب سے بڑا چیلنج اسلام ہے۔ اس چیلنج کی سنگینی میں مزید اضافہ اس وجہ سے ہوگیا ہے کہ اسلام خود مغرب میں اپنے قدم جمارہا ہے۔تارکین وطن کی صورت میں ایک معتدبہ تعداد میں مسلمان امریکہ اور یوروپ میں موجود ہیں اور اپنے عقیدہ اور تشخص

سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ تمام تر کوششوں اور منفی پروپگنڈہ کے باوجود اہل مغرب روز افزوں تعداد میں اسلام کو گلے لگا رہے ہیں۔اسلام کے خلاف زہر افشانی میں جتنی تندی آتی جاتی ہے اس کی فتوحات میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔پوری صورت حال کے گہرے تجربہ کے بعد مغرب اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس کے نظام اقدار اور اس کی تہذیب کے لیے اصل خطرہ رسالت محمدی (ﷺ) ہے۔وہ اس نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ پورا اسلامی نظام رسالت محمدی (ﷺ) پر غیر متزلزل اذعان و یقین پر قائم ہے۔اسی لیے ان کے تیز و تند حملوں کا رخ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کی طرف ہوتا ہے۔چنانچہ اس وقت جو کچھ یوروپ میں ہو رہا ہے وہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کا حصہ ہے، نیز یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہے بلکہ دراصل ان کوششوں کا تسلسل ہے جو یہودی اور عیسائی ابتدائے اسلام کے خلاف کرتے آئے ہیں۔البتہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے تحت ان کا انداز بدلتا رہتا ہے۔

ظاہر ہے اس نوع کی کوششوں کو اس طرح نہیں روکا جاسکتا۔اس سلسلہ میں کی جانے والی کوششوں کے سلسلہ میں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے دائرہ سے باہر نہ ہوں۔اس سلسلہ میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا جو آپؐ کی تعلیمات کے منافی ہو۔یہ ایک ملی ذمہ داری ہے جو پوری ہوش مندی اور احساس ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہے، اس کا ایک اچھا وسیلہ باہمی گفت وشنید اور بین المذاہب مکالمہ ہوسکتا ہے۔وقت کا تقاضا ہے کہ مثبت اور تعمیری انداز میں معاندین تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔اس تکلیف دہ صورت حال میں لامحدود امکانات بھی پوشیدہ ہیں۔ہمارے آقا نے اپنے بے مثال اخلاق سے بڑے بڑے دشمنوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔اگر ہم بھی اسی اسوہ پر عمل کریں تو ممکن نہیں کہ کامیابی ہمارے قدم نہ چومے۔مجادلہ حسنہ کو قرآن مجید نے دشمنوں کا دل جیتنے کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔یہ ذمہ داری تمام مسلمانوں کی ہے اور سب سے زیادہ مسلمان حکمرانوں کی۔بدقسمتی سے مسلمان حکمرانوں کی ترجیحات میں یہ مسئلہ شامل نہیں ہے ورنہ یہ صورت حال ہی پیش نہ آتی، شاید قدرت یہ کام مغربی ممالک میں آباد مسلمانوں سے لینا چاہتی ہے۔وہاں کے مسلمان اپنے اپنے انداز میں یہ فریضہ انجام بھی دے رہے ہیں اور گذشتہ دنوں مغربی دنیا کے مختلف خطوں سے اس سلسلہ میں حوصلہ افزا خبریں بھی آتی رہی ہیں۔کون جانتا ہے کہ یہ شرانگیزی مغرب میں بسنے والے سعید اشخاص کے لیے رحمۃ للعالمین سے واقفیت کا ذریعہ بن جائے۔یہ بات تو یقینی ہے کہ خلق عظیم کی ایک جھلک بھی جس کو نظر آجائے گی وہ اس کا گرویدہ ہو کر رہے گا۔اس قسم کے واقعات پہلے بھی وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔اب شاید ان میں اور زیادہ تیزی آنے والی ہے۔شاید پھر کعبہ کو صنم خانے سے پاسبان ملنے والے ہیں۔

مقالات

علمِ مناظر کے میدان میں ابن الہیثم کا عظیم کارنامہ

جناب الطاف احمد اعظمی

عہدوسطیٰ (Middle Ages) میں جو چند بڑے مسلم سائنس داں گزرے ہیں ان میں ابن الہیثم کا مرتبہ کئی لحاظ سے بلند ہے، وہ شیخ بوعلی سینا (متوفی ۱۰۳۷ء) کی طرح قاموسی شخصیت کا مالک تھا۔اس عظیم سائنس داں کا نام جمال الدین قفطی نے ابوعلی الحسن بن الحسن بن الہیثم لکھا ہے، ابوعلی کنیت، حسن نام والد کا نام بھی حسن اور دادا کا نام ہیثم تھا (۱)۔علامہ ابن ابی اصیبعہ نے جو نام لکھا ہے اس میں محمد کے لفظ کا اضافہ ہے، یعنی ابوعلی محمد بن الحسن بن الہیثم (۲)۔''مختصر الدول'' کے مصنف نے باپ کا نام حسین لکھا ہے (۳)۔مشہور مغربی مورخ جارج سارٹن نے حسن اور حسین دونوں لکھا ہے (۴)۔علمی دنیا میں یہ مسلم سائنس داں ابن الہیثم کے نام سے معروف ہے۔لاطینی میں اس کا نام "Alhazen" ہے۔(۵)

ابن الہیثم بصرہ میں ۳۵۴ھ مطابق ۹۶۵ء میں پیدا ہوا (۶) اور ۴۳۰ھ مطابق ۱۰۳۸ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا (۷)۔تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ابن الہیثم عراق سے مصر گیا جہاں خلیفہ الحاکم (۹۹۶-۱۰۲۱ء) حکم راں تھا (۸)۔تذکرہ نویسوں نے اس انتقال مکانی کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں ۔ جمال الدین قفطی نے لکھا ہے کہ فاطمی خلیفہ کو علوم حکمیہ سے گہرا شغف تھا۔جب اس کو معلوم ہوا کہ ابن الہیثم بڑا صاحب علم وکمال ہے اور اسے یہ بات بھی بتائی گئی کہ وہ دریائے نیل پر بند باندھ کر اس کو زیادہ فائدہ مند بنا سکتا ہے تو اس نے مال کثیر بھیج کر اسے

آر زیڈ۔۹۰۱ بی، لین نمبر ۲۴، فلیٹ نمبر ۴۰۲، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹۔

مصر آنے کی دعوت دی۔ ابن الہیثم اس کی دعوت پر مصر پہنچا۔ حاکم نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا اور نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ اسے مہمان بنایا۔ چند روز کے بعد حاکم نے ابن الہیثم سے کہا کہ وہ اپنے دعویٰ کے مطابق دریائے نیل پر بند باندھنے کا کام شروع کرے۔ اس مقصد کے لیے اس نے کاری گروں اور مزدوروں کی ایک جماعت اس کی معاونت کے لیے متعین کردی۔ ابن الہیثم دریائے نیل اور اس کے اردگرد کی قدیم تعمیرات کے معائنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کام ممکن نہیں ہے اور حاکم کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا۔ اس نے ناراض ہوکر اسے ایک معمولی عہدہ دے دیا۔ ابن الہیثم نے خوف جان کی وجہ سے اس عہدے کو قبول کرلیا۔ لیکن یہ جان کر کہ حاکم متلون مزاج اور سریع الغضب ہے اس نے مشہور کردیا کہ وہ فاتر العقل ہے۔ حاکم نے اس کی تمام املاک پر قبضہ کرلیا اور اسے اس کے گھر کے ایک حصہ میں قید کردیا۔ الحاکم کی وفات کے بعد اس کی دیوانگی جاتی رہی اور وہ اپنے گھر سے نکل کر جامعہ ازہر کے ایک قبہ میں مقیم ہوگیا اور نہایت سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔(۹)

جمال الدین قفطی نے یہ بھی لکھا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں ابن الہیثم کا ذریعۂ معاش کتابت تھی۔ وہ سال میں ایک بار اقلیدس، متوسطات اور مجسطی کو اپنے ہاتھوں سے لکھتا اور اس کی آمدنی سے زندگی بسر کرتا تھا، یہاں تک کہ ۴۳۰ھ میں وہ فوت ہوگیا۔(۱۰)

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے ایک مصری ریاضی داں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابن الہیثم پہلے بصرہ میں وزارت کے عہدے پر فائز تھا لیکن اس کا میلان علم وحکمت کی طرف تھا۔ اس لیے اس نے مشہور کردیا کہ وہ دیوانہ ہے اور اس حیلے سے وہ ملازمت سے سبکدوش ہوگیا۔ اس کے بعد وہ مصر چلا گیا اور جامعہ ازہر کے ایک گوشے میں پوری زندگی گزار دی۔ گزربسر کے لیے وہ سال میں ایک بار اقلیدس اور مجسطی اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا اور اسی حالت میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔(۱۱)

اس سلسلے میں ایک تیسرے مورخ علی بن زید بیہقی (متوفی ۱۱۷۰ء) کا بیان زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ابن الہیثم نے ''علم الحیل'' (Mechanism) پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں ایک حیلہ یہ بیان کیا گیا تھا کہ جب دریائے نیل کے پانی کے کم ہوجانے سے زراعت کو نقصان پہنچے تو اس کو کس طرح جاری کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کو لے کر وہ مصر پہنچا اور ایک سرائے میں مقیم

ہوا۔ایک روز اس سے کہا گیا کہ الحاکم شاہ مصر باب المدینہ پر اس سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ ابن الہیثم کتاب مذکور کو ساتھ لے کر اس کی ملاقات کے لیے نکلا اور باب المدینہ پہنچ کر حاکم سے ملا اور اپنی کتاب اس کی خدمت میں پیش کی ۔اس نے کتاب پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد کہا کہ یہ ناممکن العمل اور گراں صرفہ منصوبہ ہے۔الحاکم کے اس برتاؤ سے مایوس اور کسی قدر خوف زدہ ہوکر وہ شام چلا گیا اور وہاں ایک امیر کے یہاں مقیم ہوا۔(۱۲)

مذکورہ بیان سے قفطی کی روایت کی تردید ہوتی ہے۔صحیح بات یہ ہے کہ دریائے نیل پر بند باندھنے کے لیے جس قدر مصارف، تجربہ کار عملہ اور آلات درکار تھے اس کی فراہمی مصر کے لیے ممکن نہ تھی جیسا کہ الحاکم نے ابن الہیثم سے ملاقات کے وقت کہا کہ یہ منصوبہ گراں صرفہ ہے۔ اس منصوبے سے ابن الہیثم کی دست برداری کی وجہ اس کے سوا کوئی دوسری نہ تھی۔ محمد لطفی جمعہ نے بھی اپنی کتاب میں اس رائے کو ترجیح دی ہے۔(۱۳)

علم و فضل: تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ ابن الہیثم ایک یگانۂ عصر عالم و فاضل تھا۔علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے:

و کان فاضل النفس ، قوی الذهن ، مـقـفـنـنـا فی العلوم ، لم یماثله احد من اهل زمانه فی العلم الریاضی و لا یـقـرب منه ، و کان دائم الاشتغال ، کثیـر التـصـانیف ، و افـر التذهد ، محبا للخیر ۔(۱۴)	وہ علم و فاضل، ذکی وفطین، مختلف علوم وفنون میں یکتا، اس کے ہم عصروں میں کوئی بھی علم ریاضی میں اس کے ہم پلہ نہ تھا، (ہم پلہ تو کجا) اس سے قریب بھی نہ تھا۔ وہ ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مشغول رہتا تھا، کثیر التصانیف تھا، نہایت زاہد و عابد اور خیر سے محبت رکھنے والا تھا۔

بیہقی اس کے زہد و اخلاق کے متعلق لکھتا ہے:

و کـان ابـو عـلـی ابـن الهیثم ورعا ، متعبدا منظما لا وامر الشریعة ۔(۱۵)	ابوعلی بن الہیثم صاحب زہد و ورع، عبادت گزار اور احکام شرعیہ کی پابندی کرنے والا تھا۔

مشہور مغربی مورخ جارج سارٹن نے اس کے علم و فضل کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”وہ ایک عظیم ماہر طبیعیات اور بصریات (Optics) کا ایک عہد ساز عالم تھا۔

اس کے علاوہ وہ ایک فاضل ہیئت داں، ریاضی داں اور طبیب بھی تھا''۔(۱۶)

ابن الہیثم ابتدا میں تشکک (Scepticism) میں مبتلا تھا۔اس نے اپنی کتابیات پر مشتمل ایک رسالہ لکھا ہے جس کے آغاز میں ہی وہ رقم طراز ہے کہ ''میں بچپن سے ہی لوگوں کے مختلف عقاید اور ان کے مختلف فرقوں کے اپنے اپنے اختراعی عقاید سے انسلاک پر غور کرتا رہتا تھا اور مجھ کو ان سب میں شک تھا اور اس بات پر یقین تھا کہ حق ایک ہی ہے، اختلاف صرف اس کے طریقے میں ہے۔اس لیے جب میں امور عقلیہ کے ادراک میں کامل ہوا تو حق کی جستجو میں مصروف ہوگیا تا کہ ظن وشک کی ملمع کاریاں اور گمراہیاں دور ہوجائیں۔میں نے ایک ایسی رائے حاصل کرنے کا ارادہ کرلیا جو اللہ کی رضامندی، اس کی اطاعت اور تقویٰ تک پہنچا دے۔چنانچہ میں مختلف عقاید و آراء کے دریا میں گھس پڑا لیکن اس غواصی سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور حق کا راستہ مجھ پر منکشف نہ ہوسکا۔پھر میں ارسطو کی منطق، طبیعیات اور الٰہیات کی طرف متوجہ ہوا اور یہاں مجھے محسوس ہوا کہ میں اس راہ سے حق تک پہنچ سکتا ہوں۔چنانچہ میں نے علوم فلسفہ یعنی علم ریاضی، علم طبیعی اور علم الٰہی (الٰہیات) کی تحصیل میں پوری قوت صرف کردی اور ان کے اصول ومبادی معلوم کرلیے۔پھر جب میں نے دیکھا کہ انسان فانی ہے اور صرف جوانی میں ان اصولوں پر اچھی طرح غور کرسکتا ہے، بڑھاپے میں یہ ممکن نہیں تو میں نے حتی الامکان ان اصولوں کی تلخیص وتشریح کی اور ان کی فروع میں ایسی کتابیں لکھیں جو ان اصولوں کی گویا توضیح وتشریح تھیں۔اس وقت ذی الحجہ کا مہینہ ہے اور جب تک زندہ رہوں گا، اس قسم کے کاموں میں اپنی قوت صرف کرتا رہوں گا''۔(۱۷)

ابن الہیثم نے اپنے عہد کے جملہ مروجہ علوم حاصل کیے اور ان میں کمال پیدا کیا تھا۔سب سے پہلے وہ یونانی علوم کی طرف متوجہ ہوا۔فلکیات اور میکانکی علوم (مراکز اثقال، رفع اثقال وحیل) سے متعلق جو تراجم تھے ان کو نقل کیا اور پھر ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔اس کے علاوہ ہندو فارس کے جو علوم تھے ان کو بھی نقل کرلیا۔ان تراجم کے ساتھ ان علوم پر مسلم علماء نے جو شروح وتعلیقات لکھی تھیں جن میں یونانی فضلاء کی غلطیوں کو واضح کیا گیا تھا اور ان میں اضافے بھی کیے گئے تھے، ان سب کا اس نے مطالعہ کیا۔فلسفہ میں کندی وفارابی، طب میں ابوبکر زکریا رازی، کیمیا میں جابر بن حیان، ریاضی میں خوارزمی، ثابت بن قرہ، بنوشاکر، فلکیات میں ابومعشر حنین ابن اسحاق، احمد بن کثیر

فرغانی، سہل بن بشیر، محمد بن جابر حرانی (معروف بہ بتانی)، عبدالرحمٰن صوفی، ابوالوفاء وغیرہ اور طبیعیات میں ابن سینا کی تصنیفات اس کے زیر مطالعہ رہیں۔ان کتابوں کے علاوہ اصول اقلیدس، مخروطات اپولونیوس، مقالات ارشمیدس (مراکز اثقال ومرایا محرقہ)، بطلیموس کی کتاب ''علم المناظر'' (طبیعیات) اور ''المجسطی'' (فلکیات)، منطق وطبیعیات میں ارسطو اور طب میں جالینوس کی کتابوں سے بھی اس نے استفادہ کیا۔

ابتدا میں ابن الہیثم نے جو کتابیں لکھیں ان میں اس نے قدماء کی آراء کو نقل کر دیا ہے یا ان کا اختصار کر دیا ہے لیکن جب اس کے علم ونظر میں پختگی پیدا ہوئی اور مطالعہ وسیع ہو گیا تو اس نے متقدمین کے علمی کاموں پر تنقیدی نظر ڈالی اور ان پر اعتراضات وارد کیے۔اس دور میں اس نے علوم فلسفہ وطبیعی سے متعلق جو کتابیں لکھیں ان میں تنقیدی رجحان غالب ہے۔مثلاً ایک رسالہ ہے ''**فی الرد علی یحییٰ النحوی ما نقضه علی ارسطاطالیس وغیره من اقوالهم فی السماء والعالم**''، ایک دوسرا رسالہ ہے ''**الی بعض ما نظر فی هذا النقد فشک فی معانی فیه**''، ایک تیسرا رسالہ ہے ''**فی الرد علی ابی الحسن علی ابن عباس نقضه آراء المنجمین**''، پھر جواب الجواب کے طور پر لکھا ''**علی رد ابی الحسن علی معارضیه**''۔

اسی طرح ابن الہیثم کا ایک مقالہ ہے ''**فی الرد علی ابی هاشم رئیس المعتزله ما تکلم به علی کتاب السماء والعالم لارسطاطالیس**''۔اسی نوع کے دوسرے رسائل بھی ہیں جن میں ان سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں جو اس نے بعض معتزلیوں سے کیے تھے۔بعض رسائل مسائل منطق سے متعلق ہیں، ان رسائل میں ان سوالات کا حل پیش کیا گیا ہے جو اس نے منطقیوں سے کیے تھے۔مسائل فلسفہ پر بھی اس کے کئی رسائل ہیں، مثلاً ایک مقالہ اس عنوان سے ہے **تباین مذهب الجیریین والمنجمین**۔

ان علوم کے علاوہ ابن الہیثم نے ریاضی اور طبیعی علوم سے متعلق جو کتابیں لکھیں ان کے عنوانات سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فکر میں استقلال ہے اور ان علمی راہوں میں بھی گام فرسائی کی ہے جن میں متقدمین اب تک نہیں چلے تھے مثلاً ''**کتاب الجامع فی اصول الحساب**'' ''**فی اصول الهندسیه والعددیة**'' ''**فی حل شک علی اقلیدس فی المقالة الخامسة**

من کتابه"، "فی برهان الشکل الذی قدمه ارشمیدس" ۔

ابن الہیثم نے دینی مسائل سے متعلق بھی بعض رسائل لکھے ہیں، مثلاً "استخراج سمت القبلہ" ۔علم کلام سے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس میں ثبوت نبوت فراہم کیے گئے ہیں اوران لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو نبوت کے قائل نہیں تھے۔ایک رسالہ حدوث عالم سے متعلق ہے جس میں متکلمین کے دلائل پر نقد ہے۔ایک اور رسالہ حدوث صفات باری تعالیٰ کے بارے میں ہے جس میں معتزلہ کے خیالات کی تردید کی گئی ہے۔

یہ تمام کتابیں ابن الہیثم نے اپنی علمی زندگی کے ابتدائی دور میں لکھیں جو دراصل تحصیل علم کا دور تھا۔اس کے بعد تخلیق اور ابتکار فکر کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔اس دور میں اس نے جو کتابیں لکھیں وہ علمی و تحقیقی اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔

ابن الہیثم نے اپنے ایک رسالے میں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، ذی الحجہ ۴۱۷ھ تک کی اپنی تصنیفات کی فہرست درج کی ہے۔اس فہرست کے مطابق اس نے ۲۵ کتابیں ریاضی میں اور ۴۴ کتابیں طبیعیات، الٰہیات اور طب سے متعلق لکھیں۔ان میں سے آخری کتاب طب پر ہے جو جالینوس کی کتابوں کی تلخیص ہے۔(۱۸)

تصانیف کی اس کثرت سے صاف ظاہر ہے کہ ابن الہیثم تصنیف و تالیف سے غیر معمولی شغف رکھتا تھا اور زندگی کے آخری وقت تک وہ اس کام میں مشغول رہا۔اس کی وفات کے بعد اس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور تیرہویں صدی کی ابتدا میں بغداد میں اس کی بعض کتابیں جلائی گئیں (۱۹)۔ لیکن اس کی علمی عظمت و شوکت کل کی طرح آج بھی قائم ہے۔

ابن الہیثم کو اس کی جس کتاب نے شہرت دوام بخشی وہ "کتاب المناظر" ہے۔ہر دور کے اہل علم نے اس کتاب کی تحسین و توقیر کی ہے۔علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اس فن میں یونانیوں کے علاوہ مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں ابن الہیثم کی کتاب سب سے زیادہ اہم ہے۔(۲۰)

مشہور مغربی مورخ جارج سارٹن لکھتا ہے:

"ابن الہیثم ایک عظیم ماہر طبیعیات اور بصریات (Optics) کا ایک عہد ساز عالم تھا۔اس کے علاوہ وہ ماہر علم ہیئت، عظیم ریاضی داں اور طبیب بھی تھا۔اس کی کتاب

''علم المناظر'' کے لاطینی ترجمہ نے مغربی سائنس کو کافی متاثر کیا ہے، بالخصوص راجر بیکن اور کپلر جیسے مغربی سائنس دانوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ فی الواقع اس کتاب نے استقرائی طریقوں (Experimental Methods) کو کافی ترقی دی''۔(۲۱)

موسیو لیبان ''تمدن عرب'' میں لکھتا ہے:

''من جملہ ان تصانیف کے الحسن (ابن الہیثم) کی نہایت عجیب وغریب کتاب ''المناظر'' ہے جس کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا اور جس سے کپلر نے اپنی کتاب ''مناظر'' میں بہت کچھ کام لیا ہے۔ اس میں نہایت محققانہ ابواب ہیں...... موسیو شامل جن سے بہتر اس امر میں کوئی رائے دینے والا نہیں ہے، الحسن کی اس کتاب کو یورپ کی کل معلومات علم مناظر کا ماخذ خیال کرتے ہیں''۔(۲۲)

ابن الہیثم درحقیقت ایک تجربی عالم (Experimental Scientist) تھا۔ اس نے اپنے اصول وقواعد کو تجربہ کی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ مثلاً جب اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ روشنی ایک شفاف جسم (Transparent Media) میں خط مستقیم میں چلتی ہے تو اس بات کو تجربہ کرکے دکھایا۔ ''انعطاف نور'' اور ''انعکاس نور'' کی تشریح میں بھی اس نے اسی طریقے کی پیروی کی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تجربی سائنس کی بنیاد اہل مغرب نے رکھی ہے لیکن یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تجربی سائنس کے بنیاد گزار مسلم سائنس داں تھے جن میں ابن الہیثم کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں تجربہ (Experiment) کے لیے ''اعتبار'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور "Experimental Scientist" کو ''معتبر'' کہا ہے۔ یہ لفظ تجربہ سے کہیں زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے۔ اعتبار انکشاف سے زیادہ ثبوت کا حامل ہے، یہ مشاہدہ کو قطعیت کا درجہ دیتا ہے۔ ابن الہیثم نے علم مناظر ومرایا (Optics) میں جو اعلیٰ درجے کی تحقیقات کی ہیں ان کا ذکر ہم یہاں تفصیل سے کریں گے تاکہ ہمارا یہ دعویٰ کہ تجربی سائنس کی بنیاد مسلم سائنس دانوں نے رکھی ہے پوری طرح متحقق ہوجائے۔

علم مناظر ومرایا (Optics): علم مناظر ومرایا دراصل طبیعیات (فزکس) کی ایک شاخ ہے۔

اس سلسلے میں ابن الہیثم کی تحقیقات کے دو جزء ہیں، ایک نظریۂ نور (Theory of Light) اور دوسرا نظریۂ ابصار (Theory of Vision)۔ان دونوں نظریات سے متعلق اس کی تحقیقات کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

نظریۂ نور: اصحاب تعالیم (Mathematicians) مثلاً اقلیدس (Euclid d. 3rd B.C.) اور بطلیموس (Ptolemy 2nd A.d.) نے روشنی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ حرارت ناریہ ہے جو اپنی ذات سے روشن اجسام (Self Luminous Bodies) سے خارج ہوتی ہے جیسے سورج اور آگ سے روشنی نکلتی ہے اور جب یہ کسی مقعر آئینہ (Conclave Mirror) سے منعکس ہوکر نقطۂ واحد پر مرتکز ہوتی ہے تو احتراق (Burning) کو قبول کرنے والی چیز کو جو اس کے بالکل قریب ہو، جلا دیتی ہے۔(۲۳)

اس سلسلے میں فلاسفۂ طبیعین (نیچرل فلاسفر) کا نظریہ یہ ہے کہ روشنی اس حرارت ناریہ کی جنس سے ہے جو اپنی ذات سے روشن اجسام (**اجسام مضئیه بذاته**) سے خارج ہوتی ہے لیکن نفس وذہن سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا یعنی وہ وقت کے اندر وجود ذاتی نہیں رکھتی۔ یہ تعریف فلسفۂ ارسطو سے ماخوذ ہے۔(۲۴)

ابن الہیثم نے ان دونوں مسلکوں میں سے اول الذکر یعنی اصحاب تعالیم کے تجربی طریقوں کو لیا لیکن ان کے اصولوں کو بدل دیا اور اس معاملے میں فلاسفۂ طبیعین کی پیروی کی اور اس طرح ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے امتزاج سے اس نے ایک الگ راستہ اختیار کیا۔ابن الہیثم نے روشنی کو ایک عامل یا خارجی موثر قرار دیا جو اپنی ذات کے اعتبار سے وجود عینی (Real Existence) رکھتی ہے۔(۲۵)

تعریف نور کے بعد ابن الہیثم نے اس کی خصوصیات بیان کیں اور بتایا کہ روشنی بعض اجسام میں نفوذ کرتی ہے اور بعض میں نفوذ نہیں کرتی۔اول الذکر شفاف اجسام (Transparent Bodies) اور موخر الذکر کثیف اجسام (Opaque Bodies) کہلاتے ہیں۔شفاف اجسام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ روشنی کو واپس کردیتے ہیں اور کثیف اجسام اس کو قبول کرتے ہیں۔جن شفاف واسطوں (Media) سے روشنی نفوذ کرتی ہے ان میں پانی، ہوا اور بلور داخل ہیں۔اس سلسلے میں ابن الہیثم کا ایک بڑا کارنامہ یہ انکشاف ہے کہ روشنی منور اجسام کے ہر نقطہ (پوائنٹ)

سے اور ہر سمت میں خارج ہوتی ہے اور خط مستقیم (Straight Line) میں چلتی ہے۔اس کے ثبوت میں اس نے اپنے مختلف تجربات کا ذکر کیا ہے۔ایک جگہ لکھتا ہے:

''جب سورج کی روشنی کسی تاریک کمرے میں اس کے سوراخ سے داخل ہوتی ہے اور کمرے کی ہوا غبار یا دھواں کی وجہ سے مکدر ہو تو روشنی اس سوراخ کی سیدھ میں اور پھیلتی ہوئی (ممتد) ظاہر ہوتی ہے اور اس سے گزر کر اپنے منتہٰی یعنی کمرے کی زمین یا دیوار تک پہنچتی ہے اور جب کمرے کی ہوا بالکل صاف ہوتی ہے تو روشنی کا پھیلاؤ (امتداد) بظاہر محسوس نہیں ہوتا۔اب تجربہ کرنے والا ایک کثیف جسم لے اور اس سے سوراخ اور موقع ضو کے درمیان سیدھی سمت کو قطع کرے تو وہ دیکھے گا کہ روشنی جسم کثیف پر تو ظاہر ہوتی ہے لیکن کمرے یا دیوار کے اس مقام سے غائب ہو جاتی ہے جہاں وہ پہلے ظاہر تھی''۔(۲۶)

اس سلسلے میں ابن الہیثم نے صبح کی روشنی کو بھی بطور دلیل پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ اس لیے ہلکی ہوتی ہے کہ سورج کے پورے جرم سے شعاعیں خارج ہو کر افق تک نہیں پہنچتیں کیونکہ سورج افق کے نیچے ہوتا ہے، اس کے علاوہ شعاعیں خط مستقیم میں چلتی ہیں اس لیے بھی روشنی مدھم ہوتی ہے۔

روشنی کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد ابن الہیثم نے اس کی قسمیں اور ان کے قوانین کا ذکر کیا ہے۔اس نے روشنی کی دو قسمیں قرار دی ہیں، ایک کا نام ''اضوائے ذاتیہ'' (Essential Light) اور دوسری کا نام ''اضوائے عرضیہ'' (Accidental Light) ہے۔جو روشنی اپنی ذات سے روشن اجسام (اجسام مضیئہ بذاتہ) مثلاً سورج اور آگ سے نکلتی ہے وہ ''اضوائے ذاتیہ'' ہے، کبھی وہ اس کو ''اضوائے اولیٰ'' (Primary Light) بھی کہتا ہے۔یہ اضواء جب کثیف اجسام کی سطحوں پر واقع ہوتی ہیں تو ان کو روشن کر دیتی ہیں۔اس قسم کے روشنی قبول کرنے والے کثیف اجسام سے جو اضواء خارج ہوتی ہیں ان کو وہ ''اضوائے ثانی'' (Secondary Light) کہتا ہے اور جب یہ اضواء کثیف اجسام کی سطحوں پر واقع ہوتی ہیں تو ان کو روشن کر دیتی ہیں اور ان سے جو اضواء خارج ہوتی ہیں ان کا نام اس نے اضوائے ثالث رکھا ہے۔اضوائے ثانی اور اضوائے ثالث ہی کا نام ''اضوائے عرضیہ'' (Accidental Light) ہے۔اضوائے ثانی و ثالث ان اجسام سے

خارج ہوتی ہیں جو بذات خود روشن نہیں ہوتے لیکن ان سے ''اجسام مضیٔیہ بذاتہ'' (اپنی ذات سے روشن اجسام) یا اجسام متضیئہ (وہ اجسام جو خود سے روشن نہیں ہوتے بلکہ خارجی ذرائع سے روشنی قبول کرتے ہیں) کے قرب کے سبب سے روشنی خارج ہوتی ہے۔

ابن الہیثم نے مذکورہ ذاتی و عرضی اضواء کی بنیاد پر ضوء صبح اور ضوء شفق کی کیفیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ''ہم دیکھتے ہیں کہ صبح کی روشنی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب رات کا ایک حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ روشنی عمود (Perpendicular) کی شکل میں افق مشرق سے پھیلتی ہے اور وسط آسمان تک جاتی ہے لیکن یہ نہایت کمزور ہوتی ہے، پھر آہستہ آہستہ یہ روشنی قوی ہوتی ہے اور اس کی مقدار طول و عرض میں برابر بڑھتی اور نور کو قوی کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ اس ضوء منکشف کے مقابل زمین کا جو رخ ہوتا ہے وہ ایک حد تک روشن ہو جاتا ہے اگرچہ فضا میں موجود روشنی کے مقابلے میں یہ روشنی کمزور ہوتی ہے۔ اس کے بعد فضا کی روشنی بدستور قوی ہوتی اور پھیلتی جاتی ہے یہاں تک کہ افق مشرق اس سے پُر ہو جاتا ہے اور وسط آسمان تک پہنچ جاتی ہے اور فضا روشنی سے بھر جاتی ہے۔ ٹھیک اس وقت وہ روشنی بھی قوی ہو جاتی ہے جو زمین کے رخ پر موجود ہوتی ہے اور دن پورے طور پر ظاہر ہو جاتا ہے، لیکن اس حالت میں بھی سورج افق کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سورج طلوع ہوتا ہے اور دن اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ دن کے آخری حصے میں جب سورج غروب ہوتا ہے اور افق کے نیچے چلا جاتا ہے تو اس وقت بھی فضا اور زمین پر روشنی کی یہی کیفیت ملتی ہے''۔ (۲۷)

افق پر روشنی کس قانون کے تحت ظاہر ہوتی ہے اس کو بیان کرتے ہوئے ابن الہیثم لکھتا ہے ''ہوا اگرچہ لطیف واسطہ ہے اور اس سے روشنی آسانی کے ساتھ گزر جاتی ہے۔ لیکن وہ کچھ نہ کچھ کثافت بھی رکھتی ہے (کوئی جسم لطیف ایسا نہیں جو کثافت سے خالی ہو) سورج کی روشنی جب کہ وہ افق کے نیچے ہوتا ہے، اس ہوائے مقابل تک پہنچ جاتی ہے جو اس وقت زمین کے اوپر موجود ہوا سے دور ہوتی ہے اور رات کی تاریکی ہنوز باقی رہتی ہے۔ جب یہ روشنی ہوائے مقابل تک پہنچتی ہے تو اس کے لطیف ہونے کی وجہ سے اس کے اکثر حصے میں سرایت کر جاتی ہے چونکہ اس میں کثافت بھی ہوتی ہے اس لیے روشنی کو قبول کر لیتی ہے اور جب روشن ہو جاتی ہے تو اس سے ''ضوء عرضی'' کا اخراج عمل میں آتا ہے۔ یہ روشنی سمتوں میں پھیلتی ہے اور اس ہوا میں نفوذ کر جاتی ہے جو زمین کے اوپر ہوتی ہے۔

اس روشنی سے سایہ زمین کے کنارے حواشی زمین سے متصل ہوتے ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ''ضوءِ عرضی'' اپنے مصدر اشراق سے جتنا دور ہوتی ہے کمزور ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ان حصوں تک پہنچ جاتی ہے جہاں اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا''۔(۲۸)

روشنی سے متعلق اہم امور کے بیان کے بعد ابن الہیثم نے قوانین نور (Laws of Light) سے بحث کی ہے جسے اختصار کے ساتھ یہاں لکھا جاتا ہے:

قانون انعکاس: روشنی جب کسی مسطح جسم (Smooth Body) مثلاً مسطح آئینہ پر پڑتی ہے تو وہ اس کو قبول کرنے کے بجائے اسے ایک متعین سمت میں واپس بھیج دیتا ہے۔ اس کو روشنی کا انعکاس (Reflection of Light) کہتے ہیں۔ یہ انعکاس متعین ضابطے کے مطابق انجام پاتا ہے، مثلاً واقع ہونے والی کرن (Ray) واقع نقطہ (Point of Incidence) اور منعکس کرن (Reflected Ray) تینوں ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ زاویہ واقع (Angle of Incidence) زاویہ انعکاس (Angle of Reflection) کے مساوی ہوتا ہے۔ یہی حقائق قانون انعکاس کہلاتے ہیں۔

ابن الہیثم نے انعکاس کا جو تصور پیش کیا ہے وہ میکانکی ہے۔ بعد کے ادوار میں اس میکانکی تصور کو ابن الہیثم کے بجائے نیوٹن کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ ابن الہیثم نے بتایا کہ جب کوئی جسم متحرک اپنی حرکت کے دوران میں کسی جسم ساکن سے ملاقی ہوتا ہے تو وہ اس کی حرکت کے استمرار کو روک دیتا ہے اور جسم متحرک پر جسم ساکن کی ہیئت کذائی کے اختلاف سے مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ یہ واضح طور پر انعکاس کی میکانکی تشریح ہے۔

ابن الہیثم نے حرکت کی دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک حرکت طبعی اور دوسری حرکت عرضی۔ حرکت عرضی وہ حرکت ہے جو کسی جسم پر فاعل کے فعل کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے۔ حرکت طبعی کی مثال اس نے یہ دی ہے کہ اگر تجربہ کرنے والا (معتبر) لوہے یا تانبے کے ایک چھوٹے اور چکنے گولے کو جس کا وزن ایک مثقال سے زیادہ نہ ہو، کسی بلند مقام سے جو بیس گز سے زیادہ نہ ہو، لوہے کی ایک مستوی (ہموار) اور افقی پلیٹ (Horizontal Plate) پر گرائے اور پلیٹ سے گولے کے ملاقی ہونے اور اس کے بعد کے واقعات پر غور کرے تو اس تجربہ سے ظاہر ہوگا کہ گولا پلیٹ سے ملاقی ہونے کے بعد بلندی کی طرف لوٹتا ہے پھر نیچے کی طرف گر جاتا ہے۔ اسی طرح اگر گولے کو دور کی

مسافت سے گرایا جائے تو پلیٹ سے اس کی رجعت زیادہ قوی ہوگی اور قریب کی مسافت سے گرانے پر رجعت کم ہوگی۔(۲۹)

ابن الہیثم نے ایک دوسرے تجربے کا بھی ذکر کیا ہے جو مختصراً اس طرح ہے ''مذکورہ پلیٹ کو ایک ایسی دیوار میں پیوست کر دیا جائے جو زمین کی سطح پر قائم ہو اس طرح کہ اس کی سطح بلند ہو۔ گولے کو تیر کمان میں رکھ کر پوری قوت سے پھینکا جائے اس طرح کہ پہلی حرکت پلیٹ کی سطح پر قائم عمود (Perpendicular) کی سیدھ میں ہو اور دوسری حرکت ایک ایسے خط کی سیدھ میں ہو جو پلیٹ کی سطح پر مائل اور افق کے مقابل ومتوازی ہو۔ پھر ان دونوں حالتوں پر غور کیا جائے۔ مشاہدہ کرنے والا دیکھے گا کہ پہلی حالت میں گولا پلیٹ کی سطح سے عمودی حالت میں لوٹتا ہے اور یہ بھی دیکھے گا کہ رجوع کے وقت گولا افق کے مقابل ہوتا ہے اور پھر گر جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری حالت پر تامل کرنے والا دیکھے گا کہ گولا جس جہت سے پھینکا گیا تھا اس کے مقابل کی جہت میں لوٹتا ہے اور یہ بھی دیکھے گا کہ وہ پہلی رجعت میں افق کے مقابل ومتوازی خط میں متحرک ہوتا ہے اور پلیٹ کی سطح کی طرف جھکا ہوتا ہے اور پھر گولا نیچے کی طرف گر جاتا ہے۔ جس وقت گولا پھینکنے والے کی حرکت قوی ہوتی ہے تو گولے کا رجوع بھی قوی ہوتا ہے''۔

آگے مزید لکھتا ہے ''اگر کوئی بھاری جسم بلندی سے گرایا جائے اور گرنے کی جگہ سخت ہو مثلاً چٹان، لوہا یا اسی قسم کی چیزیں، تو وہ جسم نہ صرف راجع ہوتا ہے بلکہ قوی حرکت کے ساتھ راجع ہوتا ہے لیکن اگر گرنے کی جگہ نرم ہے جیسے ریت یا اس کے مشابہ اشیاء تو اس میں رجوع کا عمل نہیں ہوتا یعنی وہ چیز لوٹتی نہیں ہے۔ اور اگر گرنے والے جسم میں نرمی وسختی دونوں موجود ہیں مثلاً چونا یا لکڑی وغیرہ تو اس حالت میں رجوع کمزور ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر پھینکنے والے نے ایک پتھر کسی سمت میں پھینکا اور یہ کسی سخت جسم سے اپنی حرکت کے ختم ہونے سے پہلے ٹکرایا تو وہ راجع ہوگا، اگر حرکت قوی ہوگی تو وہ اپنی ہی قوت سے راجع ہوگا اور اگر کسی نرم جسم مثلاً اُون، روئی، مٹی یا کسی اور سریع الانفعال جسم سے ٹکرایا تو یا تو اس سے چمٹ جائے گا یا نیچے گر جائے گا اور اپنی جہت حرکت کی طرف راجع نہ ہوگا اور اگر کسی ایسے جسم سے ملاقی ہوا جس میں صلابت ولینت دونوں ہیں تو صلابت کے اعتبار سے رجوع ضعیف ہوگا اور پھر نیچے گر جائے گا''۔(۳۰)

ان مثالوں کو پیش کر کے ابن الہیثم نے بتایا کہ روشنی کا انعکاس بعینہٖ عمل میں آتا ہے۔جس طرح نیوٹن کے نظریہ نور پر اعتراض وارد ہوا اسی طرح ابن الہیثم بھی اعتراض سے محفوظ نہ رہا کیونکہ دونوں ہی سائنس دانوں کا نظریہ میکانکی تھا۔ابن الہیثم پر جس شخص نے اعتراض کیا وہ کمال الدین فارسی (متوفی ۱۳۱۱ء) تھا۔ یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ کمال الدین فارسی نے حرکت اضواء کا جو نظریہ پیش کیا وہ عہد حاضر کے نظریہ کے عین مطابق ہے۔اس نے بتایا کہ روشنی کی حرکت، حرکت اجسام کے بجائے حرکت اصوات کے مطابق ہے۔اس کے الفاظ ہیں" **انما ھی علی نحو حرکة الاصوات لاعلی نحو حرکة الاجسام**" ۔(۳۱) (باقی)

ماخذ وحواشی

(۱) تاریخ الحکماء، جمال الدین قفطی، طبع مصر ۱۳۲۶ھ، ص۱۱۴۔ (۲) عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ابن ابی اصیبعہ، طبع بیروت ۱۹۶۵ء، ص۵۵۰۔ (۳) مختصر الدول، ص۳۱۶۔ (۴) انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس، جارج سارٹن، طبع نیویارک ۱۹۵۳ء، ج۱، ص۷۲۱۔ (۵) ایضاً۔ (۶) عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ص۵۵۰، مزید دیکھیں تاریخ فلاسفۃ الاسلام، محمد لطفی جمعہ" تذکرہ ابن الہیثم"۔ (۷) تاریخ الحکماء، ص۱۱۴۔ (۸) خلیفہ حاکم بامر اللہ علماء وحکماء کا بڑا قدرداں تھا اور خود بھی صاحب علم تھا۔ چنانچہ اسی کے عہد میں مشہور ماہر علم ہیئت ابن یونس مصری (۹۵۰-۱۰۰۸) اس کی قائم کردہ رصدگاہ کا نگراں تھا۔ الحاکم نے قاہرہ میں ایک عظیم الشان لائبریری قائم کی جو شہرت کے اعتبار سے بغداد کے "بیت الحکمۃ" کے ہم پلہ تھی ۔(۹) تاریخ الحکماء، ص۱۱۴-۱۱۵۔ (۱۰) ایضاً، ص ۱۱۵۔ (۱۱) عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ص۵۵۰ ۔ (۱۲) تتمہ صوان الحکمت، علی بن زید بیہقی، ص ۷۸۔ (۱۳) تاریخ فلاسفۃ الاسلام، محمد لطفی جمعہ، اردو ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین، طبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۴۱ء، ص۳۷۳۔ (۱۴) عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ص۵۵۰۔ (۱۵) الحسن بن الہیثم، بحوثہ وکثوفہ البصریۃ، مصطفیٰ نظیف بک، طبع مصر ۱۹۴۲ء، ج۱، ص۲۳۔ (۱۶) انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس، ج۱، ص۷۲۱۔ (۱۷) عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ص۵۵۲۔ (۱۸) ایضاً، ص۵۵۱-۵۵۷۔ (۱۹) تاریخ فلاسفۃ الاسلام، ص ۳۷۸۔ (۲۰) مقدمہ ابن خلدون، ص۵۳۳۔ (۲۱) انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس، ج۱، ص۷۲۱۔ (۲۲) تمدن عرب، موسیو لیبان، ص۴۳۴۔ (۲۳) الحسن بن الہیثم، ج۱، ص۷۹۔ (۲۴) ایضاً، ص۸۰۔ (۲۵) ایضاً، ص ۷۹۔ (۲۶) ایضاً، ص۱۵۰۔ (۲۷) ایضاً، ص۹۱۔ (۲۸) ایضاً، ص۹۲۔ (۲۹) ایضاً، ص۱۲۲۔ (۳۰) ایضاً، ۱۲۵۔ (۳۱) تنقیح المناظر، کمال الدین ابوالحسن فارسی، طبع حیدرآباد دکن ۱۳۴۷ھ، ج۱، ص۳۷۳۔

نثار علی بخاری بریلوی: چند معروضات

ڈاکٹر عارف نوشاہی

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب صاحب کے رشحات قلم سے حسب ذیل دو مضامین معارف اعظم گڑھ کے دو پرچوں میں شایع ہو چکے ہیں:

۱-''انشاے دلکشا کا تعارف''، جلد ۱۶۵، عدد ۶، جون ۲۰۰۰ء، ص ۴۳۸-۴۴۹۔

۲-''مفتاح الخزائن''، جلد ۱۷۶، عدد ۱، جولائی ۲۰۰۵ء، ص ۲۲-۳۲۔

انشاے دلکشا اور مفتاح الخزائن، دونوں سید نثار علی بن سید اعظم علی بخاری بریلوی کی فارسی تصانیف ہیں، جن کا سال تصنیف بالترتیب ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء اور ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء ہے۔ دونوں تصانیف کے مندرجات پر ڈاکٹر ادیب کے محولہ بہت عمدہ تعارفی اور تجزیاتی مضامین ہیں۔

جیسا کہ ڈاکٹر ادیب نے جو خود اہل بریلی ہیں، دونوں مضامین میں اس جانب اشارہ کیا ہے کہ نثار بریلوی کے خاطر خواہ حالات زندگی نہیں ملتے۔ یقیناً ایسا ہی ہے اور مجھے بھی اس ضمن میں کوئی کامیابی نہیں ملی۔ لیکن ان کی تصانیف کے سلسلے میں میرے پاس کچھ ایسی باتیں ہیں جو ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقالات میں نہیں آسکیں یا ان کے مقالات کی اشاعت کے بعد معرض وجود میں آئی ہیں۔ ان سب کو بطور معروضات پیش کر رہا ہوں تا کہ آیندہ جب کبھی نثار علی بریلوی یا ان کی تصانیف پر کچھ لکھا جائے تو یہ بھی پیش نظر رہیں۔

چہار گلزار: فارسی قواعد زبان اور علم بلاغت پر ایک کتاب چہار گلزار، مطبوعہ اور مخطوطہ دونوں طرح ملتی ہے۔ اس کے دیباچے میں مصنف نے اپنا نام ''نثاری'' بتایا ہے۔ ''اضعف بندگان باری، نثاری چنین گوید'' (ص ۲)۔ چونکہ مصنف، ''باری'' کے وزن پر ''نثاری'' لایا ہے اس لیے چہار گلزار کے نثاری کی تصنیف ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ میرے پیش نظر اس کا مطبع

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

نظامی کان پورے ۱۲۷۷ھ کا ایڈیشن ہے، اس میں نثاری پر حاشیہ نمبر دے کر، حاشیے میں لکھا ہے: ''تخلص مصنف''۔ یہ بات بھی طے ہے کہ مصنف نے کتاب کے دیباچے میں صرف اپنے تخلص سے کام لیا ہے اور اصل یا خاندانی نام نہیں بتایا، نہ کتاب کے مقدمے میں اور نہ کتاب میں آگے کسی اور مقام پر۔ چہار گلزار کے کچھ مطبوعہ نسخے برٹش میوزیم لندن میں بھی موجود ہیں۔ میوزیم کے فہرست نگار ایڈورڈ ایڈورز نے ان کا تعارف ''نثار علی ابن اعظم علی بخاری بریلوی'' مصنف کے تحت درج کیا ہے اور اس کے متعاقب اور متصل، اسی نثار علی کی دوسری تصنیف انشائے دلکشا کی پانچ اشاعتوں کا تعارف لکھا ہے (ص ۵۹۴-۵۹۵)۔ گویا ایڈورڈ ایڈورز کے نزدیک چہار گلزار کا نثاری، وہی انشائے دلکشا کا نثار علی بریلوی ہے۔ ایڈورڈ ایڈورز نے یہ کیسے طے کیا؟ مجھے کم از کم اس کی فہرست سے اس قرینے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ بعد میں سی اے اسٹوری نے پرشین لٹریچر (جلد۳، ص ۱۳۰) میں اور مولوی عبدالمقتدر نے فہرست بانکی پور (جلد ۱۷، شمارہ ۱۶۰۴) میں ایڈورڈ ایڈورز کے اس حوالے کو استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن مجھے دو باتوں کا جواب نہیں ملا۔ اگر مفتاح الخزائن انہی نثار علی بریلوی کی تصنیف ہے تو ان کا تخلص ''نثار'' تھا: ''این خاکسار ارادت مندان ابرار، نثار علی بخاری المتخلص بہ نثار'' (مفتاح الخزائن، ص ۸ بحوالہ ادیب، ۳۱)۔ عبارت کے اس ٹکڑے سے صاف واضح ہے کہ مصنف نے ''نثار'' کی رعایت سے اس کے ہم وزن الفاظ خاکسار اور ابرار کا استعمال کیا ہے۔ لہٰذا اس کا تخلص ''نثار'' ہے ''نثاری'' نہیں۔ انشائے دلکشا کے دیباچے میں مصنف نے اپنے تخلص کا سرے سے ذکر نہیں کیا اور سیدھا سادا اپنا نام ''این مملوِ خاکساری سید نثار علی بخاری بریلوی'' لکھا ہے (ص ۲)۔ یہاں ''بخاری'' کی رعایت سے ''خاکساری'' لایا گیا ہے، حالانکہ اسی وزن پر مصنف اپنے نام کے ساتھ ''نثاری'' کا اضافۂ تخلص بھی لا سکتا تھا۔ میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ ایڈورڈ ایڈورز کے پیش نظر چہار گلزار اور انشائے دلکشا دونوں تھیں۔ ان دونوں کتابوں کے دیباچے میں مصنف نے اپنا نام، ولدیت کے ساتھ نہیں لکھا (کم از کم میرے پیش نظر ان دونوں کتابوں کے جو ایڈیشن ہیں، ان میں تو ایسا ہی ہے)، پھر ایڈورڈ ایڈورز نے نثار علی کو اعظم علی کا بیٹا کہاں سے لکھا؟ کیا اس کے پیش نظر کوئی اور ذریعۂ معلومات تھا؟ افسوس ہے کہ یہ مقالہ لکھتے ہوئے مفتاح الخزائن مجھے دستیاب نہیں ہے۔

دیکھنا ہے کہ اس کے دیباچے میں نثار علی نے اپنے والد کا نام لکھا ہے یا نہیں؟ اوپر میں نے ڈاکٹر ادیب کے حوالے سے جو ٹکڑا مفتاح سے نقل کیا ہے کم از کم اس میں تو والد کا نام نہیں ہے۔

چہار گلزار کا مزید تعارف یہ ہے کہ یہ ایک برطانوی افسر سر گور اوزلی (Gore Ouseley) (۱۷۷۰-۱۸۴۴ء) کی فرمایش پر تصنیف ہوئی۔ مصنف نے اس افسر کے لیے دیباچے میں طویل القابات استعمال کیے ہیں۔ سر گور اوزلی ۱۲۰۳ تا ۱۲۲۰ھ/ ۱۷۸۸ تا ۱۸۰۵ء ہندوستان، بالخصوص لکھنؤ میں مقیم رہے۔ بعد میں ایران میں برطانوی سفیر مقرر ہوئے۔ ان کے مستند، مفصل حالات انسائیکلو پیڈیا ''ایرانیکا'' کی مندرجہ ذیل ویب سائٹ پر دیکھے جا سکتے ہیں:

http://www.iranicaonline.org/articles/ouseley-sir-gore

چہار گلزار کی تصنیف کا زمانہ وہی ہے جو نثار علی بریلوی کی دیگر دو تصانیف (انشاے دلکشا اور مفتاح الخزائن) کا ہے۔ چہار گلزار کو مصنف نے چار ''گل زار'' پر تقسیم کیا ہے اور ہر ''گل زار'' میں مزید کئی ''گل'' ہیں، اس ترتیب سے: گلزار یکم در ۵ ''گل'': ۱-تقسیم اسماے حروف تہجی و تفصیل زبان پارسی، ۲-اقسام وافعال واسامی حرکات وسکنات، ۳-تشریح انواع حروف مفردہ ومرکبہ و تغییر وتبدیل بعضی از حروف، ۴-تقسیم اضافت وقاعدۂ محمول برقلب، ۵-تفسیر امالہ وترخیم وقاعدۂ متفرقات گلزار دوم در ۲ ''گل'': ۱-صنایع لفظی، ۲-صنایع معنوی، گلزار سوم در ۲ ''گل'': ۱-اقسام نظم وابتدای شعر، ۲-عروض، گلزار چھارم در ۳ ''گل'': ۱-تشبیہ، ۲-استعارہ، ۳-قوافی۔

کتاب میں مصنف کا فارسی نمونۂ کلام بھی ملتا ہے۔ یہ اشعار مصنف کے ہیں:

براہ عشق ترا گر روارویست ضرور — دوا دوی مکن ای دل مہر و مہ شب وروز (ص،۸)

پروردگار تا کہ ترا مثل ماہ نو — پیوستہ در ترقی و تابانی آورد

دارد کسی کہ از تو بدل بغض و کینہ ای — او را مثال بدر بہ نقصانی آورد (ص،۲۴)

نامت بہ سینہ اندر چون جان عزیز وخوشتر — نما رخ ای ستمگر رویت مدینۂ ما

دلہا بہ پیش چشمت، جانہا بہ ترس خشمت — آن بس بود زحشمت، این بس قرینۂ ما (ص،۳۸)

چہار گلزار، اپنے موضوع پر برصغیر میں ایک مقبول عام کتاب رہی ہے۔ یہ اپنے زمانۂ تصنیف سے لے کر ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء تک کم از کم ۴۲ بار طبع ہوئی۔ میں نے اپنی کتاب، کتاب شناسی

آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ میں ان سب اشاعتوں کا احاطہ کیا ہے (جلد۲/صفحات ۹۱۵-۹۱۶)۔

انشائے دلکشا: نثار علی بریلوی کی انشا نگاری پر یہ کتاب اگرچہ اسی نام سے چھپتی رہی ہے لیکن اس کا اصل نام ''منشآت دلکشا'' ہے۔ خود مصنف نے لکھا ہے: ''بہ اسم منشآت دلکشا موسوم ساخت'' (ص ۳)۔ ڈاکٹر ادیب کے پیش نظر چونکہ اس کا مطبع شعلہ طور، کان پور، دسمبر ۱۸۸۷ء ایڈیشن تھا، اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ کتاب اپنی تالیف کے ۹۳ سال بعد (پہلی بار) طبع ہوئی تھی (ص ۲۳)۔ حالانکہ یہ کتاب اس سے بہت پہلے ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں لکھنو سے طبع ہو چکی تھی اور ۱۸۸۷ء کے آتے آتے اس کے ۲۲ ایڈیشن نکل چکے تھے، جن کی تفصیل میں نے اپنی محولہ بالا کتاب میں دی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ۱۵/ ایڈیشن ہیں۔ غرضے کہ بہت مقبول کتاب رہی ہے۔ ڈاکٹر ادیب کے پیش نظر جو ایڈیشن تھا، اس کی بنیاد پر انہوں نے کہا ہے کہ ''مولف نے حاشیہ نگاری کا اہتمام پوری کتاب میں کیا ہے اور لغات کے حوالے بھی دیے ہیں'' (ص ۴۴۲)۔ میرا گمان ہے کہ یہ حواشی مولف کے نہیں، بلکہ ناشر کی طرف سے کسی کو مامور کر کے لکھوائے گئے ہیں، چونکہ انشاے دلکشا، کتب درسی یا آموزشی میں شمار ہوتی تھی اور طالب علموں اور مبتدیوں کے استعمال میں رہتی تھی، اسے لیے طلبہ کی سہولت کے لیے ناشرین کسی سے حواشی لکھوا کر کتب شایع کرتے تھے۔ بعض اوقات محشی کے نام کا اعلان کر دیا جاتا تھا، بعض اوقات اخفا میں رکھا جاتا تھا۔ میرے پیش نظر انشاے دلکشا کا ۱۲۹۵ھ کا نول کشوری ایڈیشن ہے۔ یہ بھی حواشی سے بھرپور ہے لیکن محشی کے نام کے بغیر۔

مفتاح الخزائن: پروفیسر نثار احمد فاروقی نے مفتاح الخزائن کو پہلے رسالہ بیاض، دہلی کے شمارہ ا، سال ۸ (۱۹۸۸ء) میں شایع کروایا تھا۔ بعد میں اسی چھاپے پر سرورق لگا کر اگلے سال دہلی سے کتابی صورت میں شایع کیا۔ اس کتاب کے بارے میں حسب ذیل مقالات بھی شائع ہو چکے ہیں:

۱- شہناز آرا بیگم، ''معرفی مفتاح الخزائن''، تحقیقات فارسی، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۶-۲۳۴۔

۲- ریحانہ خاتون، ''مفتاح الخزائن کا اردو ترجمہ''، تحقیقات فارسی، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۸-۱۵۴۔

مآخذ

ادیب، سید لطیف حسین ''انشائے دلکشا کا تعارف''، معارف، اعظم گڑھ، جون ۲۰۰۰ء، ص ۴۳۸-۴۴۹۔ ایضاً ''مفتاح الخزائن''، معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۲۰۰۵ء، ص ۲۲-۳۲۔ نثار علی بخاری بریلوی، انشائے دلکشا، مطبع نول کشور، (لکھنو یا کان پور) ۱۲۹۵ھ۔ ایضاً، مفتاح الخزائن، بہ تدوین نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۸۹ء۔ نثاری، چہار گلزار، کانپور، مطبع نظامی، بہ اہتمام محمد عبدالرحمان، ۱۲۷۷ھ۔ نوشاہی، عارف، کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ (ہند، پاکستان، بنگلادیش)، تہران، مرکز پژوہشی میراث مکتوب، ۲۰۱۲ء۔

Edwards, Edward, *A Catalogue of the Persian Printed Books in the British Museum*, London, 1922;

Storey, C.A, *Persian Literature, A Bio-Bibliographical Survery*, Leiden, 1984;

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں اور علامہ شبلی نعمانی کے روابط

ریاست رام پور اور تحریک ندوۃ العلماء کے خصوصی حوالہ سے

حکیم وسیم احمد اعظمی

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔فکر و نظر اور مسلسل جدو جہد ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔معالجہ میں حذاقت کے مرتبہ پر فائز تھے۔طب یونانی میں جدید تحقیق کے بانی اور نصاب تعلیم میں تجدید کے علمبر دار تھے اور طبّی مسائل پر عمیق نظر رکھتے تھے۔غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔تحریک آزادیٔ ہند کی جدو جہد میں ان کی خدمات قائدانہ تھیں۔ان کے مزاج میں روایتوں کے احترام کے ساتھ جدت اور اختراعیت تھی۔پامال راہ پر چلنا ان کی طبیعت کے منافی تھا۔جب تک علاج معالجہ میں رہے یکتا اور بے مثل رہے۔انگریز بہادر سے ''حاذق الملک'' کا خطاب پایا،قوم نے ''مسیح الملک'' کے لقب سے ملقب کیا۔طب میں تحقیق کی طرف توجہ کی تو تحقیق کاروں کی ایک جماعت پیدا کردی۔نصاب تعلیم میں تجدید کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میں انقلابی روش اختیار کی اور عمل بالید کو نصاب تعلیم میں دوبارہ شامل کیا،جو اہل فن کی بے عملی کے سبب مجہول ہو گیا تھا۔انگریز بہادر نے یونانی طب اور آیوروید پر شب خوں کی تدبیر کی تو ''آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس'' نامی تنظیم قائم کر کے ان کی چال پلٹ دی،گوروں کا دیا ہوا ''حاذق الملک'' کا خطاب لوٹا دیا اور عام رائے کو محسوس کر کے شمس العلماء خواجہ حسن نظامی نے ملک و قوم کی طرف سے ''مسیح الملک'' کا جو خطاب تجویز فرمایا،

waazmi@yahoo.com

اس کو قبول کیا (۱)۔خواتین میں تعلیمی بیداری کا اس قدر احساس کہ علاحدہ سے ''مدرسہ طبیہ زنانہ'' قائم کیا۔مطالعہ کا شوق اتنا کہ ریاست رام پور کے کتب خانے کے طبی و اسلامی ادب کے نوادر اور مخطوطات اس کے گواہ، ملکی اور غیر ملکی اسفار میں بھی طب یونانی کے فروغ اور جدید تعلیمی جہات کی تلاش، ملی، ملکی اور قومی حمیت اس قدر کہ اپنی حکمت عملی سے کبھی سورج نہ غروب ہونے والی قوم کے سورج کو غروب ہونے پر مجبور کر دیا۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کی شخصیت ایک مفکر، مدبر اور مصلح قوم کی تھی۔ان کی اصلاح کا مجال بہت وسیع تھا۔اس دور میں ملک میں چلنے والی بہت سی تحریکوں کے قائد رہے۔طرز تعلیم اور نصاب تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کوشاں رہے۔انھوں نے نہ صرف طبی تعلیم میں اصلاح کی بات کی، بلکہ مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں بھی تغیر و تبدل کی ضرورت کا احساس دلایا، تاکہ امت مسلمہ سارے عالم میں ممتاز اور باوقار رہے۔اسلامی اداروں اور مسلم دانشوروں سے ان کے مراسم میں یہی عوامل کارفرما تھے۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کی شخصیت کی تعمیر میں قیادت و سیادت کے عناصر صالحیت کے ساتھ شامل تھے۔اس وقت کے حالات نے ان میں آہنی عزم و استقلال بھر دیا تھا۔ صالحیت کی وجہ سے اخوت و مودت اور امداد باہمی کا جذبہ ان کے یہاں خوب ملتا تھا۔وہ ملت میں اتحاد و اتفاق کو رحمت تصور کرتے تھے۔تعلیمی اداروں اور فلاحی انجمنوں میں ربط باہمی کے قائل تھے اور ہر حال میں ان کا زاویۂ نگاہ صلح جویانہ اور اصلاحی ہوتا تھا۔احترام انسانیت ان کا نصب العین تھا۔

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی علم و دانش کے دستخط، اسلامی علوم وفنون کے ماہر، عصری معنوی رویوں کے واقف کار، روایتوں کے شعوری احترام اور تہذیبی التزام کے ساتھ جدید خیالات کی شمولیت کے موید تھے۔ان کی سوچ حکیم محمد اجمل خاں سے بہت سے مجال فکر و عمل میں ایک سی تھی۔ان کی مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں سے روابط اور تحریک ندوۃ العلماء سے وابستگی بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی۔ وہ ندوۃ العلماء تحریک سے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک شدت کے ساتھ وابستہ رہے تھے (۲)۔انھوں نے ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی ۱۹۱۰ء اور اجلاس کان پور ۱۹۲۶ء کی

صدارت بھی کی تھی۔شبلی نعمانی سے ان کے مراسم بہت پرانے تھے اور مزاج میں بھی بہت حد تک ہم آہنگی تھی۔نصاب تعلیم میں عصری حسیت کے حامل مضامین کی شمولیت، بے پناہ ذوق مطالعہ، کتاب خانوں کی دید کے اشتیاق، غیر ملکی سیاحت اور استخراج نتائج میں یکسانیت کو بھی اس میں بڑا دخل تھا۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں،شبلی نعمانی کے علمی تبحر کے معترف تھے اور ان کی بیشتر تالیفات مسیح الملک کے مطالعہ میں رہی تھیں۔وہ ان کی تحریروں کی جامعیت،عصری حسیت اور اجتہادی فکر کے مداح تھے۔کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق عالمانہ تحقیق، الجزیہ اور مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم میں پیش کردہ ان کے نظریوں اور اصلاحی منصوبوں سے بھی انہیں بالکلیہ اتفاق تھا۔ المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، الغزالی،علم الکلام، الکلام، دستۂ گل،موازنۂ انیس و دبیر اور شعرالعجم کے علمی مقام سے بھی واقف تھے۔

مسیح الملک اور شبلی نعمانی کے روابط باہمی میں ندوۃ العلماء کے تعلیمی و تدریسی مسائل اور ان کے حل کی تلاش کو بھی بڑا دخل تھا۔تحریک ندوۃ العلماء کا ابتدائی تخیل مولانا سید محمد علی مونگیری نے ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام، کان پور کے سالانہ جلسہ میں پیش کیا تھا۔اس تحریک کے دو بنیادی مقاصد تھے:

۱- رفع نزاع باہمی (علماء کی باہمی نزاع،خصوصیت کے ساتھ اور عام مسلمانوں کی عمومیت کے ساتھ)۔ ۲-اصلاح طریقۂ تعلیم (جس کا اہم جزو نصاب تعلیم کی توسیع و ترقی اور حذف واضافہ)۔

اس اجمال کی تفصیل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے لفظوں میں:

> ”اس تحریک کی اساس (علی گڑھ کی تعلیم جدید اور تہذیب مغربی کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے برخلاف) خالص دینی تھی،یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا“۔(۳)

مزید لکھتے ہیں:

''اس تحریک میں طبقۂ علماء کو (جو شریعت اسلامی کا حامل و امین، کتاب وسنت کا شارح و ترجمان اور اسلام کا اصل نباض ہے) مرکزی مقام دیا گیا ہے اور اسی کو امت کی تعمیر و تخریب، ترقی و تنزل اور اصلاح و فساد کا اصل ذمہ دار قرار دے کر اپنی دعوت و جدو جہد کا محور بنایا گیا ہے کہ امت میں اصلاح حال کی کوئی کوشش حقیقی طور پر اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی، جب تک علماء اس کے داعی اور علمبردار نہ بنیں اور ان میں امت کی رہنمائی و قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو۔ اس کے لیے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب وسنت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے، دوسری طرف حالات زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی''۔ (۴)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مزید لکھتے ہیں:

''اس تحریک کا اولین بنیادی مقصد رفع نزاع باہمی تھا، جس کا تعلق سب سے پہلے علماء کے مذہبی و فقہی نزاعات و اختلافات سے تھا، جس نے علمی تحقیق و مباحثہ سے آگے بڑھ کر مقاتلے، عدالتی چارہ جوئیوں، فوج داریوں اور باہمی تذلیل و تضلیل، بلکہ تکفیر و تفسیق کی شکل اختیار کر لی تھی اور سارا ہندوستان اس کی وجہ سے ایک مذہبی دنگل بنا ہوا تھا''۔ (۵)

شبلی نعمانی کا تعلیمی زاویۂ نگاہ عام روش سے ہٹ کے تھا۔ غیر معمولی مطالعہ اور استخراج نتائج میں ان کے عہد میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا، ان کی فکر میں اختراعیت اور اجتہادیت تھی۔ وہ کسی فن کو محض قدامت کی وجہ سے نہ تو بابرکت تصور کرتے نہ ہی کسی جدید علم کو صرف جدید ہونے کی وجہ سے ترجیح دیتے تھے۔ ان کی ترجیحات اور استرداد کا انحصار ''عصری تقاضوں'' کے تناظر میں اسلامی فکر کی تفہیم و توسیع میں حصہ داری یا عدم حصہ داری پر تھا۔ شبلی نعمانی نے اپنی اس ''سوچ'' کی بھاری قیمت چکائی تھی۔ اپنے سب سے بڑے محسن سرسید احمد خاں سے بھی ان کے نظریاتی اختلافات میں یہی عوامل کارفرما تھے۔ اگر کسی ''بڑے'' کے پاس اس کی اپنی کوئی سوچ نہ ہو، اپنی کوئی رائے نہ ہو، وہ صرف اقوال کا ''حافظ محض'' ہو تو اس سے کسی کو کیا اختلاف ہوسکتا ہے؟ حسن اتفاق کہ شبلی نعمانی کے یہاں اپنی نظر بھی تھی اور اپنا نظریہ بھی، ایسے میں اپنے عہد کے ''دانشوروں'' سے اختلاف تو ہونا ہی

تھا۔ اگر دانشوری ''تعلیم اور صحبت'' سے آتی ہے، تو اس کی افادیت آفاقی ہوتی ہے اور اگر دانشوری صرف ''صحبت'' کی رہین ہے اور تعلیم سے اس کا رشتہ ''محض روایتی'' ہے، تو اس دانشوری کی کوئی ''کاٹ'' نہیں۔ شبلی نعمانی کو اپنی علمی زندگی میں دونوں ہی طرح کی دانشوری سے واسطہ پڑا تھا۔ ان کے مزاج کی تکوین میں اخلاط اربعہ میں سے ایک خاص خلط کا تناسب کچھ زیادہ ہی تھا اور اس خلط کا خاصہ ہے کہ اس کے حامل کے یہاں ارتجال کے ساتھ غیر معمولی قطعیت ہوتی ہے۔ تشکیک، تذبذب، تردد اور لیت و لعل کا ان کے یہاں گذر نہیں ہوتا۔ ندوۃ العلماء کے حوالہ سے بھی شبلی نعمانی کے بارے میں جو ''حکایات'' ملتی ہیں، ان میں ''رفقائے کار'' کے اذہان و افکار میں اتحاد و اتفاق کی کمی کو بڑا دخل تھا۔ جس کا اعتراف بعض بہی خواہان اور دانشوران ندوۃ العلماء نے بھی کیا ہے۔ ندوۃ العلماء کے تاسیسی محرکات میں اسلامی تعلیمات کی تفہیم و توسیع کے مقصد سے مدارس دینیہ میں مروج نصاب تعلیم کی تجدید بھی تھی۔ بعض اکابر ندوۃ العلماء جدید نصاب تعلیم کی ترتیب اور اس کے نفاذ میں متردد تھے، ان کو فکر اس بات کی تھی کہ کہیں اس نصاب تعلیم کی وجہ سے ''روایتی روحانیت'' میں اضمحلال کے عناصر نہ در آئیں اور شبلی نعمانی اپنے مٹھی بھر رفقاء کے ساتھ اس پر مصر کہ جدید نصاب تعلیم کا نفاذ جلد ہو، تاکہ طلبہ کے ذہنوں کی تعمیر اس نہج پر کی جا سکے۔ بہرحال اسلام کا تحفظ اور اس کی تعلیمات کی نشر و اشاعت، دونوں کے مطمح نظر تھیں۔ مولانا شمس تبریز خاں لکھتے ہیں:

> ''اس اختلاف کا سبب نصاب تعلیم میں فوری اور انقلابی تبدیلیوں پر مولانا شبلی کا پیہم اصرار اور بعض اوقات ان کا ایسا بے لوچ طرز عمل تھا، جس سے ارکان کی اکثریت کو احساس برتری اور ان کے جذبات و خدمات سے صرف نظر کا احساس ہوتا تھا''۔ (۶)

یہاں اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ ندوۃ العلماء کے موجودہ نصاب اور طریقۂ تعلیم پر غور کر کے اپنی سفارشات پیش کرنے کی ذمہ داری صرف مولانا شبلی نعمانی کو ہی تفویض نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، جس میں مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ مولانا لطف اللہ، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا ظہور الاسلام، مولانا ابراہیم آروی، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا

عبدالغنی، مولانا محمد حسین بٹالوی اور مولانا عبداللہ انصاری بھی شامل تھے (۷)۔ لہٰذا اس نصاب تعلیم میں جو بھی مضمون یا کتاب شامل یا خارج ہوتی، وہ باہمی مشاورت اور افادی حیثیت پر بحث ومباحثہ کے بعد ہی ہوتی۔ جہاں تک نئے نصاب تعلیم کے نفاذ کے لیے مولانا شبلی نعمانی کے ''پیہم اصرار'' کی بات ہے تو یہ فطری بات ہے کہ جو امر کسی تحریک کا بنیادی مقصد ہو اور اس سے محض ایک ''موہوم اندیشہ'' کی وجہ سے ''صرف نظر'' کیا جائے، کسی طور مناسب نہیں ہے۔ جدید نصاب تعلیم کے نفاذ میں اس لیت ولعل کی اصل وجہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی یہ تھی:

> ''مولانا (شبلی نعمانی) میں وہ پابندی واتقاء اور مذہبی تورع اور تقدس، جو علمائے دین کا خاصہ ہے، نہیں تھا اور اس لیے ان علماء کی نگاہوں میں، جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے، مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا اور اس بنا پر وہ طلبہ کے لیے ان کی تعلیم وصحبت کو سخت مضر سمجھتے تھے''۔ (۸)

مولانا شبلی نعمانی کے بارے میں اس طرح کے خیالات، ان کے علمی جانشین مولانا سید سلیمان ندوی کے تھے، جنہوں نے ان کی خلوت اور جلوت میں ایک عمر گذاری تھی اور وہ ان کے معمولات زندگی کے انتہائی قریبی مشاہد تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کا دینی شعور بہت بالیدہ تھا، مذہبی امور پر ان کی کاربندی پر بھی کسی کو شبہ نہیں تھا، لیکن یہ ایک بڑی سچائی ہے کہ ان کی پابندی، اتقاء، مذہبی تورع اور تقدس میں روایتی ''صحبت'' کے عناصر زیادہ نہیں تھے، جس کا مطالبہ ان کے معاصر علماء اور اراکین ندوۃ العلماء کر رہے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی نعمانی کے مذہبی رجحانات اور مذہب پر کاربندی کے متعدد واقعات ''حیات شبلی'' میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ علی گڑھ میں طلبہ میں نماز کا ذوق پیدا کرنے میں شبلی نعمانی نے اختصاص کے ساتھ توجہ دی۔ مذہبی معلومات پیدا کرنے کی غرض سے وہ سال میں ایک دفعہ مجلس میلاد بھی کرتے تھے اور اس میں وعظ فرماتے۔ دینیات کے درس میں اتنی دلچسپی پیدا کردی تھی کہ طلبہ ان کی کلاس میں شوق سے شریک ہوتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس دور کا، شبلی نعمانی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

> ''خود سرسید کی اس شکایت پر کہ طلبہ نماز میں کیوں شریک نہیں ہوتے؟ صاف کہہ دیا کہ ''چونکہ آپ شریک نہیں ہوتے''۔ (سرسید سلسل البول کی شکایت

کے سبب گھر جا کر نماز پڑھتے تھے اور جمع بین الصلاتین بھی کرتے تھے)''۔(۹)

شبلی نعمانی کے یہاں ''عرفان ذات'' ہمیشہ سے رہا ہے، ۱۸۸۳ء میں جب وہ علی گڑھ کالج سے بحیثیت استاذ نئے نئے وابستہ ہوئے تھے اور ان کا مشاہرہ صرف چالیس روپے تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس دور کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

> ''کالج میں کوئی تقریب تھی، جس میں استاذوں کی کرسیاں تنخواہ کی ترتیب سے بچھائی گئی تھیں، اس ترتیب سے مولانا کی کرسی سب سے پیچھے تھی، بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے، مگر آنکھ پرنم ہوئے بغیر نہ رہی''۔(۱۰)

مولانا شبلی نعمانی جو محسوس کرتے، غیرارادی اور غیر شعوری طور پر اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے، بعد میں شدید احساس ندامت بھی ہوتا۔ مولانا سید سلیمان ندوی سر سید احمد خاں کے تعلق سے ان کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

> ''ایک دفعہ سید صاحب بوعلی سینا کی اشارات، جو فلسفہ کی اہم کتاب ہے، دیکھ رہے تھے، کوئی الجھاؤ ایسا تھا، جس کو وہ حل نہیں کر سکتے تھے، اتنے میں وہ جا پڑے، سید صاحب نے کہا خوب آئے، یہ مقام سمجھ میں نہیں آتا۔ مولانا فرماتے تھے کہ بلاقصد میری زبان سے نکل گیا کہ ''آپ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے'' کہنے کو تو کہہ دیا مگر شرمندگی ہوئی۔ سید صاحب چپ رہے، مولانا نے کتاب کا مطلب سمجھایا، تو ان کے چہرے پر بشاشت آئی''۔(۱۱)

مولانا سید سلیمان ندوی کانفرنس گزٹ علی گڑھ کے ایڈیٹر مولوی اکرام اللہ خاں کے حوالہ سے مولانا شبلی نعمانی کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں، جس سے ''اہل معرفت'' میں شبلی نعمانی کے مرتبہ کی تعیین ہوتی ہے:

> ''۱۹۱۴ء کے شروع میں جب اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں ان کو دہلی میں قیام کا اتفاق ہوا، تو ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے حلقۂ مشائخ میں انہوں نے تصوف پر تقریر فرمائی، جو بڑی جامع و مانع و موثر تھی۔ تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ ''اگر تصوف قالی چیز ہوتی، تو میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت

کرلیتا‘‘۔(۱۲)

مولانا شبلی نعمانی کا تصور بیعت بھی ’’غیر روایتی‘‘ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ’’آخر زمانہ میں ان میں روحانی جستجو کی خلش پیدا ہوگئی تھی، اسی زمانہ میں بعض صوفیوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ ایک دفعہ ایک ملاقات میں مولانا وارث حسن صاحب نے، جن سے مولانا کے بھائی حمیدالدین صاحب الٰہ آباد یونیورسٹی کے عربی پروفیسری کے زمانہ میں جو شاید ۱۹۱۰ء ہو، بیعت ہو چکے تھے، مولانا کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن مولانا نے تقلیدی بیعت پسند نہیں کی۔ مگر ان کو مانتے تھے‘‘۔(۱۳)

مولانا شبلی نعمانی کے مذہبی خیالات کے بارے میں علماء اس لیے بھی متردد تھے کہ انہوں نے کم و بیش سولہ برس تک سرسید احمد خاں کی صحبت اٹھائی تھی اور سید ممدوح کے مذہبی عقائد ہر اہل علم پر واضح تھے اور یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ علی گڑھ جانے کے بعد شبلی نعمانی پر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے، جب علم الکلام پر ان کی توجہات سے ان کے مذہبی، عملی امور میں روایتی رنگ زیادہ نمایاں نہیں تھا۔ ندوۃ العلماء کے اراکین کے ذہنوں سے یہ بات ابھی صاف نہیں ہوئی تھی۔ اس دور میں مولانا شبلی نعمانی کی تجدید نصاب تعلیم کی موہوم زیریں لہروں کے خدشوں اور اندیشوں میں مبتلا ہونا فطری امر تھا۔

مولانا شبلی نعمانی کے تصنیفی و تالیفی مجال میں بہت وسعت، گہرائی اور گیرائی تھی۔ جس کا ایک زمانہ معترف تھا، رسالہ ’’الندوۃ‘‘ کی اشاعت مولانا شبلی نعمانی کی دیرینہ خواہشوں میں سے ایک تھی، اس کے اجراء کے لیے انہوں نے ندوۃ العلماء کے جلسوں میں بارہا آواز اٹھائی تھی اور اراکین ندوہ کو اس کے لیے خطوط بھی لکھے تھے، بہت لیت و لعل کے بعد مولانا عبدالحئی حسنی کی مساعی سے عقدہ کشان ندوہ اس طرف متوجہ ہوئے تو مولانا شبلی نعمانی کے غیر معمولی تصنیفی و تالیفی تجربوں سے صرف نظر کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو اس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا، جس سے مولانا شبلی کا کبیدہ خاطر ہونا فطری عمل تھا، بعد میں اس کی ادارت میں ان کا بھی نام شامل کیا گیا اور شبلی کی تحریک پر مولانا ابوالکلام آزاد اس کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے تھے اور انہوں نے

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک بحیثیت سب ایڈیٹر کام کیا، اس کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔ شبلی نعمانی بھی کچھ مدت بعد اس سے علاحدہ ہو گئے۔

ندوۃ العلماء سے بہ شدت وابستگی کے باوجود شبلی کے ساتھ اس کے اراکین کا رویہ دراصل ان کی مذہبی فکریات سے عدم اتفاق یا قلت اتفاق پر منتج ہے اور جب بھی شبلی کو اس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا، حکیم محمد اجمل خاں نے ان کا ساتھ دیا۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں اور مولانا شبلی نعمانی کے روابط میں کئی عوامل کا دخل تھا۔ ان میں اختراعی ذہن، کتابوں سے شغف، ریاست رام پور سے تعلق، مدرسہ عالیہ کے اساتذہ سے اکتساب فیض، عربی، فارسی اور اردو لسانیات سے دلچسپی، تجدیدِ نصابِ تعلیم، قدیم طبی ادب عالیہ سے استفادہ اور اس کے تحفظ کی مساعی اور بعض دینی امور میں سوچ کی یکسانیت شامل تھی۔

مولانا شبلی نعمانی نے عربی درسیات کی تکمیل کے بعد اپنے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی کے ایماء پر بعض علوم میں تخصص کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں ۱۲۹۲-۱۲۹۱ھ میں رام پور، دیو بند اور لاہور کا سفر کیا تھا۔ رامپور میں مدرسہ عالیہ میں ۱۲۹۱ھ میں مولانا ارشاد حسین مجددی رام پوری سے اکتساب فیض کیا تھا۔ ان کا رام پور کا دوسرا سفر ۱۸۸۸ء میں ہوا تھا، نواب مشتاق علی خاں مسند نشین تھے اور ریاست کا سارا نظم و نسق جنرل عظیم الدین خاں مدار المہام کے ہاتھ میں تھا۔ یہ بھی جدید طرز فکر کے حامی اور عامل تھے۔ شبلی نعمانی کی تحریریں ان کی نظر سے گذر چکی تھیں، مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''جنرل صاحب ممدوح نے اس مدرسہ میں سالانہ امتحان لینے اور مدرسہ کے متعلق رائے دینے کے لیے جن علماء کو تکلیف دی تھی، ان میں ایک مولانا شبلی مرحوم تھے۔ مولانا کی دلچسپی کی بڑی چیز وہاں کا کتب خانہ تھا۔ المامون کی اشاعت نے اس راز کو بھی فاش کیا کہ مولانا کو نوادر کتب سے نہ صرف واقفیت، بلکہ عشق ہے۔ اس لیے نوادر قلمی کتابوں کی قدر و قیمت اور ترتیب کے لیے وہی سب سے موزوں نظر آئے۔ چنانچہ جنرل صاحب موصوف نے ۱۸۸۸ء میں مولانا مرحوم سے اس کتب خانہ کی ترتیب و اصلاح و ترقی پر ایک مفصل رپورٹ

لکھنے کی خواہش کی، چنانچہ مولانا نے تین روز رہ کر اور کتب خانہ کو ہر طرح دیکھ کر ایک رپورٹ ۱۴؍ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو لکھ کر پیش کی، اس میں الماریوں کی ترتیب، فہرست لکھنے کا طریقہ، کتابوں پر نمبر ڈالنے کی کیفیت، نوادر کے انتخاب اور حفاظت کے طریق اور دوسری ہدایتیں درج فرمائیں''۔(۱۴)

مزید لکھتے ہیں:

''کتاب خانہ کی ترتیب میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کتابیں حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی تھیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ''کلیات رند'' اور ''کتاب الخراج'' قاضی ابو یوسف، دونوں ایک ہی صف میں تھیں۔ مختلف علمی رسائل کے مجموعے بے جوڑ رسالوں کے ساتھ مجلد تھے، نوادر کا انتخاب صرف خوش خطی اور حسن ظاہر کی بنا پر کیا گیا تھا اور اچھی کتابیں چھانٹ دی گئی تھیں۔ مولانا نے فن اور مطالب کے لحاظ اور دوسری معنوی خصوصیات کی بنا پر نوادر کے دوبارہ انتخاب کی رائے دی''۔(۱۵)

مولانا شبلی نعمانی کے مشورے پر عمل ہوا اور کتابیں زبان اور فن پر تقسیم ہوئیں، نوادر کے انتخاب میں داخلیت کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ ۱۸۹۲ء میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں ریاست رام پور سے طبیب خاص کی حیثیت سے وابستہ ہوئے تھے اور تقریباً ۹ برس تک وہاں قیام رہا، اس عرصہ میں انہوں نے نہ صرف وہاں کے کتب خانے سے استفادہ کیا تھا، بلکہ جو تنظیمی ذمہ داریاں تفویض ہوئیں تھیں، انہیں بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ حکیم سید ظل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''اس (کتب خانہ) کا اہتمام ان کے سپرد ہوا، انہوں نے نہ صرف نادر مخطوطات کا مطالعہ کیا، بلکہ بہت سے اہم قلمی نسخوں کی نقلیں بھی حاصل کیں، حکیم صاحب نے، جن کا تعلق کتب خانہ سے ۱۸۹۶ء میں قائم ہوا تھا، کتب خانہ کی فہرست بھی مرتب کی ہے، یہ ۱۹۰۱ء میں طبع ہوئی ہے، اس پر سات صفحے کا ان کا عالمانہ مقدمہ ہے''۔(۱۶)

فہرست کی ترتیب کے دوران مسیح الملک کی نظروں میں مولانا شبلی نعمانی کے اصلاحی

نکات بھی ضرور رہے ہوں گے۔ شبلی نعمانی سے مسیح الملک کے روابط میں اس کتاب خانہ کو بھی بڑا دخل ہے۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں نے طبّی علوم میں اختصاص اور فن میں حذاقت کے مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود اپنے رام پور کے زمانۂ قیام میں محمد طیب مکی جیسے یگانۂ روزگار سے عربی زبان سیکھی اور تحریر وتقریر میں کمال حاصل کیا، جس کا اعتراف مولانا شبلی نعمانی، مفتی کفایت اللہ اور جرمن مستشرق یوسف ہارویز نے بھی کیا تھا (۱۷)۔ عربی میں انہوں نے اشعار بھی کہے، جو ہنوز غیر مطبوع ہیں۔ البتہ اس کی بانگی حکیم محمد فیروز الدین کی 'رموز الاطباء' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۱۸)

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کو فارسی زبان وادب سے بھی تعلق تھا، فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور مولانا شبلی نعمانی کی ''شعر العجم'' ان کی نظر سے ضرور گزری ہوگی، مدرسہ عالیہ کے بعض اساتذہ سے بھی اکتساب فیض کی روایت ملتی ہے۔ اس طرح وہ مولانا شبلی کے ہم ذوق ہونے کے ساتھ ہی ہم ادارہ بھی تھے۔ ممکن ہے ان دونوں اکابر کے روابط میں یہ عوامل بھی کارفرما ہوں۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کے مولانا شبلی نعمانی سے روابط میں ذوق مطالعہ اور شوق سیاحت کو بھی بڑا دخل تھا۔ اس شغل میں دونوں کے اغراض ومقاصد میں بہت یکسانیت تھی۔ اس حوالہ سے دونوں کے یہاں عصری تقاضوں کے تحت عصری اسلوب میں ''اعلائے کلمۃ الحق'' اور اپنے ثقافتی وتہذیبی ورثہ کے تحفظ کا جذبہ شامل تھا۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں اور مولانا شبلی نعمانی میں مابہ الاشتراک، اسلام کے بعض جزوی مسائل میں ان کی فکر کی یکسانیت تھی۔ دونوں اسلام کے جزوی مسائل کے حل کے لیے علماء کو متوجہ کرتے تھے اور عصر حاضر کے معاشیات واقتصادیات کے تناظر میں بینک کے سودی نظام کے بارے میں علماء کی طرف سے واضح ہدایات دیے جانے کو ضروری خیال کرتے تھے۔ شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں نے مسیح الملک کی مذہبی امور سے واقفیت کا تذکرہ اپنی کتاب ''حیات اجمل'' میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''علوم مذہبی میں حدیث، فقہ، تفسیر، کلام وغیرہ سے پوری واقفیت حاصل تھی، وہ فقہ حنفی کے قائل اور عامل تھے۔ انہیں فقہ کے مسائل کو استنباط

کرنے پر عبور حاصل تھا، وہ طب کی طرح فقہ میں بھی اجتہاد کو پسند کرتے تھے اور علماء سے ہمیشہ یہ خواہش کیا کرتے تھے کہ موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق فقہ کے مسائل میں دقت نظر اور ژرف نگاہی سے کام لیا جائے''۔(۱۹)

ان دونوں اکابر ملت میں روابط کا سب سے بڑا سبب نصاب تعلیم میں اصلاح اور حذف واضافہ کی ضرورت کا احساس تھا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے طبی نصاب تعلیم میں زمانے کے تقاضوں کے تحت اجتہادی تبدیلیاں کیں اور مولانا شبلی نعمانی نے مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں عصری تقاضوں کے تحت تجدید کی بات کی اور اپنی پہلی کتاب ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' میں اس کی طرف اہل علم کو متوجہ کیا اور بعد کے ادوار میں اس میں اور بھی شدت آئی۔ ندوۃ العلماء کے اراکین کے سامنے بھی ان مسائل کو جرأت اور بے باکی سے اٹھایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دار العلوم کے قائم کرنے کا اصلی مقصد عربی طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاح کرنا تھا، قدیم نصاب تعلیم میں جو خرابیاں تھیں، مولانا نے ان پر ''الندوہ'' میں بارہا مضامین لکھے اور ندوہ کی تقریروں میں ان کو برملا ظاہر کیا''۔(۲۰)

اتفاق ایسا ہوا کہ شبلی نعمانی کو ''وقف علی الاولاد'' کی مہم کے سلسلے میں مسلم لیگ کے دہلی اجلاس میں شریک ہونا تھا، چنانچہ جب وہ دہلی آئے تو جنوری ۱۹۱۰ء میں حکیم اجمل خاں سے بھی ملے، حکیم اجمل خاں نے ان کی اس تحریک کی نہ صرف حمایت کی، بلکہ وہ اس سلسلہ میں ان کے خاص معاون ثابت ہوئے، اس دوران اصلاح ندوہ کے بارے میں بھی ان سے تبادلۂ خیال ہوا، مولانا ابوالکلام آزاد، جن کی شخصیت کی تعمیر میں شبلی نعمانی کا اہم کردار تھا، نے بھی شبلی کی اصلاح ندوہ تحریک کے بارے میں حکیم اجمل خاں کی توجہ مبذول کرائی، اس بارے میں شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں امروہوی لکھتے ہیں:

''آخر کار علامہ شبلی اور مولانا آزاد نے اس مسئلہ کی طرف حکیم صاحب قبلہ کو توجہ دلائی اور یہ خواہش کی کہ ندوہ کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر باہمی اختلاف کو رفع کرا دیجیے۔ حکیم صاحب باوجود اپنی شدید مصروفیتوں کے آمادہ

ہو گئے۔ مولانا آزاد تو اس زمانہ میں دہلی میں ہی موجود رہتے اور اخبار ''الہلال'' نکالتے تھے اور مولانا شبلی مرحوم ان دنوں تین ماہ تک حکیم صاحب کے ہاں مہمان رہے تھے۔ حکیم صاحب قبلہ نے پہلے مولوی عبدالحئی صاحب ناظم ندوہ کو خط لکھ کر ان سے خواہش کی کہ مہربانی فرما کر آپ بھی مع اپنی پارٹی کے دہلی تشریف لایئے اور تمام اختلافات کو باہم بیٹھ کر طے کر لیجیے، کیونکہ قومی درسگاہ کے منتظمین میں باہم اس قسم کے اختلافات کا وجود اس کی موت کے مرادف ہے۔ اس خط کا جواب مولوی عبدالحئی صاحب نے یہ دیا کہ ندوہ کے تمام انتظامات بالکل درست ہیں اور چونکہ آپ ہمارے مخالف طبقہ کے پروپگنڈہ سے متاثر ہو چکے ہیں، اس لیے ہم آپ کو ثالثی کے طور پر منظور نہیں کر سکتے اور دہلی آنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے''۔(۲۱)

حکیم رشید احمد خاں امروہوی کی اس تحریر سے غیر ارادتاً جوزیریں لہریں ابھری ہیں، ان میں سادہ لوحی کا تموج زیادہ ہے، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ شبلی نعمانی جدید نصاب تعلیم کے نفاذ میں شتابی کے ساتھ بہ ضد تھے، اسی عرصہ میں وقف علی الاولاد کی تحریک میں حکیم اجمل خاں کی حمایت اور تائید مل گئی، اتفاق کہ شبلی نعمانی نے ''الندوہ'' کے ''شذرہ'' میں لکھ دیا:

''اس جلسہ میں شاید مولانا حالی اور مولانا نذیر احمد صاحب بھی علماء کے پہلو بہ پہلو شریک ہوں اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ جدید تعلیم کے امیر العسکر قدیم جماعت کے علماء کی صف میں دوش بہ دوش نظر آئیں''۔(۲۲)

مولانا شبلی نعمانی کے اس ''شذرہ'' سے علمائے دین کا بالعموم اور ارکین ندوہ کا بالخصوص مضطرب ہونا، لازمی تھا، کیونکہ ان دنوں مولوی نذیر احمد کی کتاب ''امہات الامۃ'' کے مشتملات اور اس کی زبان سے عام مسلمانوں میں بڑا اضطراب تھا اور اسی اجلاس میں علمائے دین کے ساتھ مولوی نذیر احمد اور ان جیسی فکر کے لوگ شریک ہوں، بظاہر ناممکنات میں تھا، ندوہ میں ان کی شرکت کی خبر نے خود ندوہ کے اجلاس کو مورد اعتراض بنا دیا تھا۔ حکیم محمد اجمل خاں نے آگے آکر مولوی نذیر احمد اور مخالفین کے درمیان اس بات پر مصالحت کرائی کہ اس کتاب کے نسخے ضائع کرا دیے جائیں اور کتاب کے نسخوں کو ایک مجمع میں، جس میں ندوہ کے اراکین بھی تھے، نذر آتش

کردیا گیا۔لیکن ندوہ کے ''شذرہ'' سے علماء کے طبقہ کے ساتھ تھوڑی سی بھی دینی فہم رکھنے والے کی نظروں میں مولانا شبلی نعمانی کی دینی فکر کے تیئں تشویش میں اضافہ ہوگیا۔بہرحال حکیم اجمل خاں نے یہاں بھی مسیحائی کی اور متعینہ تاریخوں ۲۶-۲۸ مارچ ۱۹۱۰ء میں دہلی میں عربک کالج کے میدان میں خود حکیم صاحب ممدوح کی صدارت میں جلسہ ہوا اور ان کی غیر معمولی مساعی سے اس میں اراکین ندوہ نے بھی شرکت کی۔

قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر حکیم صاحب پوری طرح اس اصلاحی تحریک کی تائید نہ کرتے تو دہلی میں اس جلسہ کا کامیاب ہونا ناممکن ہوجاتا اور باوجود مولانا شبلی کی جدوجہد کے،ندوہ کی تحریک برباد ہوجاتی''۔(۲۳)

اسی اجلاس میں شبلی نعمانی کی تقریر کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''اسی اجلاس میں دوسرے دن ایک کتب خانۂ اعظم کی تجویز پر تقریر کی اور دارالمصنّفین کا خاکہ پہلی دفعہ پیش کیا گیا،دوسری تجویز قرآن پاک کے ایک مستند انگریزی ترجمہ کے متعلق پیش ہوکر منظور ہوئی اور تیسری تجویز انگریزی کورس کی ان غلطیوں کی اصلاح کے متعلق منظور ہوئی،جن سے اسلام اور تاریخ اسلام کے متعلق بدگمانی پھیلتی ہے''۔(۲۴)

مولانا شبلی نعمانی کے مزاج کی شتابی اور اراکین ندوہ سے ضروری توافق کی کمی کی وجہ سے بہت سے ضروری امور کے نفاذ میں غیر معمولی دشواریاں پیش آنا ایک منطقی نتیجہ تھا۔۱۹۱۰ء میں ہی طلبائے دارالعلوم کی دینی امور کی عدم پابندی کو شبلی نعمانی کے طرز تربیت سے جوڑ کر ایک تفتیشی کمیٹی تشکیل دی گئی اور حیرت تو یہ کہ اس میں شبلی نعمانی کو بھی تفتیش کے دائرہ میں لایا گیا تھا،جس سے مولانا شبلی کو شدید ذہنی اذیت پہنچی اور ان کی بے دلی اور بڑھ گئی۔ہماری ملت کا یہ بڑا المیہ ہے کہ ہماری بدقسمتی اکثر ذاتی پسند اور ناپسند سے شروع ہوتی ہے،لیکن اس پر ''اصولیات'' کا ''ورق الذہب'' چڑھا دیا جاتا ہے،تاکہ اندر کی کڑواہٹ کا پتہ نہ چلے،لیکن زمانہ کی نگاہوں سے یہ بات کہاں مخفی رہ سکتی ہے؟یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علمی ادوار میں یہ دور استخراج نتیجہ کے

تناظر میں ''عہد زریں'' کہا جاتا ہے، جس نے نہ صرف ندوہ کی تاریخ میں سنہری باب کی اساس ڈالی، بلکہ اشاعت اسلام کے حوالہ سے انتہائی معتبر اصحاب قلم پیدا ہوئے اور وقیع خدمات انجام دی گئیں۔

شبلی نعمانی کی کبیدہ خاطری اس حد کو پہنچی کہ انہوں نے جولائی ۱۹۱۳ء میں معتمد تعلیمات کے منصب سے استعفاء دے دیا، ان کے استعفے کی خبر سے طلبہ میں شدید اضطراب پیدا ہوا اور وہ اسٹرائک پر چلے گئے، اس اسٹرائک کو بھی مولانا شبلی کے مخالفین نے ان کے طریقۂ تعلیم، طرز تربیت اور ذہنی اشتراک سے جوڑ دیا، اس وقت کے ملی اخبارات ورسائل میں یہ خبر شاہ سرخی بنی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے شبلی نعمانی کی حمایت میں اپنے اخبار ''الہلال'' میں متعدد مضامین لکھے، بعض دوسرے اخبارات بھی شبلی کی حمایت یا مخالفت میں میدان میں آگئے اور اس طرح گویا یہ امت مسلمہ کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا، حالات بہت خراب ہوئے تو ایک دفعہ مسیح الملک کی مسیحائی کی ضرورت پڑی، مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنی مسیحا نفسی کا ثبوت دیا، انہوں نے پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کی اہمیت کو سمجھ کر تمام ملک کے اہل الرائے حضرات کو دہلی میں ایک مشورہ کی مجلس میں شرکت کی دعوت دی، جو ۱۰ر مئی ۱۹۱۴ء کو وہاں ہونی قرار پائی''۔(۲۵)

اسی دوران مولانا شبلی نعمانی کی کتاب ''الکلام'' اور ''علم الکلام'' کی بعض تحریروں کے تناظر میں، مولانا عبدالحق حقانی کی معیت میں شبلی کی تکفیر کی مہم شروع کردی گئی اور حکیم محمد اجمل خاں کی اصلاحی تحریک کو بے دم کرنے کی تمام کوششیں ہوئیں، لیکن متعین تاریخ ۱۰ر مئی ۱۹۱۴ء میں دلی میں ہی مولانا ثناء اللہ امرتسری کی صدارت میں اجلاس ہوا، دونوں مکتب فکر کے دانشور شریک ہوئے اور باہم تبادلۂ خیال کے بعد ایک اصلاحی سب کمیٹی بنی، بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

> ''جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ ندوہ کے لیے ایک ایسا نیا دستور العمل بنائے، جس میں کسی کو پھر مستبدانہ کاروائی کا موقع نہ ملے۔ اس دستور العمل کے بنانے کا کام حکیم صاحب مرحوم کے حسب منشاء پیرزادہ محمد حسین (پنشنر جج دہلی) کے سپرد ہوا اور حکیم صاحب، مولانا ابوالکلام صاحب، محمد علی مرحوم، مولانا ثناء اللہ

صاحب امرتسری، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، حکیم عبدالولی صاحب مرحوم (جھوائی ٹولہ، لکھنؤ) وغیرہ ممبر منتخب ہوئے''۔(۲۶)

مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے پرانی باتوں کو نہ دہراتے ہوئے اس کمیٹی کے ذریعے مصالحت کی کوششیں جاری رکھیں، لیکن ندوہ العلماء کے بعض اراکین نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ مولانا شبلی نے اپنی شہرت کی وجہ سے بعض اکابرِ ملت کو ندوہ کے مسائل کی طرف متوجہ کرکے ان کی تذلیل کی ہے، چنانچہ ۱۴/ جون ۱۹۱۴ء کو ندوہ کا جو جلسۂ انتظامیہ ہونا طے ہوا اور رکن انتظامیہ کی حیثیت سے مولانا شبلی نعمانی کو بھی مدعو کیا گیا، اس کے ایجنڈے میں بھی دہلی کی مصالحت کی کوششوں کو مشکوک قرار دیے جانے کا گمان گزرتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس جلسہ انتظامیہ میں عدم شرکت کی اطلاع ایک مکتوب کے ذریعہ دی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس خط کو ''حیات شبلی'' میں چھاپا ہے۔ خط ملاحظہ ہو:

''جناب من: السلام علیکم۔ جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۱۴/ جون ۱۹۱۴ء کا ایجنڈا پہنچا، اس زمانہ میں غالباً میں ان اطراف میں نہ رہوں گا، میری صحت اب اس کی مقتضی نہیں کہ سیرتِ نبوی کے سوا زیادہ تر اور کسی طرف متوجہ ہوسکوں''۔(۲۷)

اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے واضح کیا کہ دلی کی وہ ''اصلاحی کمیٹی'' ندوۃ العلماء کے کسی شخص واحد کے طریقۂ کار پر نقد اور محاسبے کے لیے نہیں بنی تھی۔ غرض فکریات کا تصادم بدستور رہا، البتہ شبلی نعمانی نے اپنی دلچسپیوں کا مرکز ''سیرت النبیؐ'' کی تالیف کو بنالیا تھا اور وہ اپنی تمام تر مساعی اس میں صرف کررہے تھے کہ نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی وفات کے چار مہینہ بعد ۱۸/ مارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی مصالحانہ تجویز کو منظور کرلیا گیا اور ''ناممکن ممکن اور ناقابل قبول قابل قبول'' ہوگیا۔

ہم اس مضمون کو مولانا سید سلیمان ندوی کے اس اقتباس پر ختم کرتے ہیں:

''مجلس اصلاح کی طرف سے کھلے جلسہ میں تمام خاتمے کا اعلان کیا اور دونوں فریق نے اتحاد و اتفاق کے اس پر مسرت منظر پر خوشی ظاہر کی، لیکن اس خوشی و شادمانی کے رنگین مناظر میں جو بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی، وہ یہ تھی،

کہ افسوس اس منظر کو دیکھنے کے لیے ہم میں وہ موجود نہ تھا، جس کو اس کے دیکھنے
کی سب سے زیادہ آرزو تھی، مگر اس کی روح امید ہے شاد ہوئی ہوگی''۔ (۲۸)

حوالہ جات

(۱) مادر ہمدرد، ص ۱۱۰۔ (۲) مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ (۳) حیات عبدالحئی، ص ۱۳۰۔ (۴) ایضاً، ص ۱۳۰۔ (۵) ایضاً، ص ۱۳۱۔ (۶) تاریخ ندوۃ العلماء، ج ۲، ص ۴۶۔ (۷) تاریخ ندوۃ العلماء، ج ۱، ص ۱۰۷۔ (۸) حیات شبلی، ص ۶۳۸۔ (۹) ایضاً، ص ۸۱۹۔ (۱۰) ایضاً، ص ۱۲۲-۱۲۳۔ (۱۱) ایضاً، ص ۱۲۶۔ (۱۲) ایضاً، ص ۸۳۳۔ (۱۳) ایضاً، ص ۱۷۵-۱۷۶۔ (۱۴) ایضاً، ص ۱۷۶۔ (۱۵) ایضاً۔ (۱۶) دلی اور طب یونانی، ص ۱۴۴، ۲۴۵، حکیم سید ظل الرحمٰن نے حکیم محمد رضی الاسلام ندوی کی کتاب ''حکیم اجمل خاں کی علمی خدمات''، ص ۱۰ پر کتب خانہ کی فہرست کا سنہ اشاعت مئی ۱۹۰۲ء لکھا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ یہ فہرست بعنوان فہرست کتب عربی ج ۱، موجودہ کتب خانہ، رامپور، مطبع احمدی کوچہ لنگر خانہ، رامپور سے مئی ۱۹۰۲ء میں طبع ہوئی تھی۔ (۱۷) رسائل مسیح الملک، ص ۱۲۔ (۱۸) رموز الاطباء، ج ۱، ص ۹۲۔ (۱۹) حیات اجمل (رشید احمد) ص ۲۴۔ (۲۰) حیات شبلی، ص ۴۱۲۔ (۲۱) حیات اجمل (رشید احمد)، ص ۱۲۴۔ (۲۲) الندوہ، ص ۳ فروری ۱۹۱۰ء، بحوالہ حیات شبلی، ص ۴۹۶۔ (۲۳) حیات اجمل (قاضی)، ص ۱۴۲۔ (۲۴) حیات شبلی، ص ۴۹۹۔ (۲۵) ایضاً، ص ۶۵۸۔ (۲۶) ایضاً، ص ۶۶۱۔ (۲۷) ایضاً، ص ۶۶۵۔ (۲۸) ایضاً، ص ۶۶۹۔

کتابیات:

۱- خاں، شفاء الملک حکیم رشید احمد (۲۰۰۲ء، اشاعت دوم) حیات اجمل، ایچ ایس آفسیٹ پریس، نئی دہلی۔ ۲- خاں، مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں (۲۰۰۳ء، بار دوم) تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ دوم، پاریکھ آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ندوہ روڈ، لکھنؤ۔ ۳- ظل الرحمٰن، حکیم سید (۱۹۹۵ء) دلی اور طب یونانی، ثمر آفسیٹ پریس، دہلی۔ ۴- عبدالغفار، قاضی (۱۹۵۰ء) حیات اجمل، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔ ۵- فیروزالدین، حکیم محمد (۲۰۰۹ء) رموز الاطباء، ایس ایچ آفسیٹ پریس، نئی دہلی۔ ۶- نظامی، شمس العلماء خواجہ حسن (۲۰۰۸ء) مادر ہمدرد، مطبع ایم آر پرنٹر، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۷- ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی (۱۹۷۰ء) حیاتِ عبدالحئی، نامی پریس، لکھنؤ۔ ۸- ندوی، مولانا سید سلیمان (۱۹۸۳ء، طبع چہارم) حیات شبلی، مطبع معارف، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ۔ ۹- ندوی، مولانا محمد اسحاق جلیس (۲۰۰۳ء، بار دوم) تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول، پاریکھ آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ندوہ روڈ، لکھنؤ۔ ۱۰- ندوی، حکیم محمد رضی الاسلام (۱۹۹۱ء) رسائل مسیح الملک، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ۱۱- ندوی، حکیم محمد رضی الاسلام (۲۰۰۴ء)۔ حکیم اجمل خاں کی علمی خدمات، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

بہار میں جدید اردو شاعری کی روایت

ابو جہاد ایوبی

بہار میں جدید اردو شاعری کی روایت اور ارتقا پر گفتگو کرنے سے قبل اس کے پس منظر اور اسباب وعلل پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ بہار میں جدیدیت کا رجحان کیوں اور کن حالات میں پیدا ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح ہو سکے کہ اس رجحان نے پرانی روش سے انحراف میں اور نئے افکار ونظریات کو اپنانے میں کون کون سے وسیلے اور جواز اختیار کیے۔

اردو میں ترقی پسند تحریک سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ دراصل جدیدیت ہی کی طرح ایک ردعمل کا نتیجہ تھی۔ اس سے قبل عموماً ادب کا مقصد محض دل بستگی اور تفریح طبع تھا۔ زندگی کے ٹھوس حقائق اور حالات کی حقیقی ترجمانی جیسی ہونی چاہیے نہ تھی۔ اس ترقی پسندانہ رجحان نے شاعروں اور ادیبوں کو پہلی دفعہ یہ احساس دلایا کہ ادب کا مقصد واضح ہونا چاہیے اور جو ادب اپنے سماج کا آئینہ نہیں ہوتا، اس کے معرض وجود میں آنے کا کوئی جواز نہیں۔ اس نے شعرا اور ادبا کو اس امر کی طرف بھی متوجہ کیا کہ ادب اور زندگی کو ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہیے۔ ادب محض عشق ومحبت اور رنج والم کے جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہیں، بلکہ یہ زندگی کے ہر کیف وکم کو آئینہ کرنے کا موثر وسیلہ ہے۔ یہی وہ سوچ تھی جس کی بنیاد پر انجمن ترقی پسند مصنّفین کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن کے بنیاد گزاروں نے اپنے منشور میں کہا کہ اب وقت تیزی سے بدل رہا ہے۔ پرانی قدریں زوال آمادہ ہیں۔ نئی سوچ پروان چڑھ رہی ہے۔ اس لیے ادبا وشعرا کے لیے موضوعات اور خیالات میں تغیر ناگزیر ہے، تغیرات کو سمجھنا چاہیے اور پامال مضامین وخیالات سے آزاد ہو کر اور عقل وفکر کو بروئے کار لا کر ادب کو عوام کے قریب لایا جائے۔ اسے حقیقت پسند بنایا جائے اور یہ کہ

شعبۂ ترجمہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

ادب کو زندگی کی حقیقتوں یعنی انسان کی بنیادی ضرورتوں، عصری تقاضوں اور عام انسانی زندگی کے حظ و کرب کا ترجمان ہونا چاہیے موجودہ معاشرے میں مزدوروں، محنت کشوں کی ترقی اور سرمایہ داروں، زمین داروں اور استحصالی ذہنوں کی پسپائی مقصود ہو۔ (ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری، یعقوب یاور، ص ٦٦)

ترقی پسند تحریک کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب پر بحث یہاں مقصود نہیں، صرف اس سچائی کی جانب اشارہ کرنا ہے کہ اس تحریک یا روایت کا ظہور معاشرہ کے ایک خاص مرحلے میں ہوا، جس میں ادب کے حوالے سے یہ رجحان قوی تر ہوا کہ ادب کا سماج سے رشتہ کیا ہے اور اسے کس حد تک ہونا چاہیے۔ یہ رجحان اپنے اندرون کو ظہور میں لانے میں کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرا اس کا اندازہ ترقی پسند تحریک کے نقادوں اور مورخوں کی بے شمار تحریروں سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بہر حال مسلم ہے کہ عروج و زوال کے مسلمہ اصول سے یہ تحریک بھی دوچار ہوئی، جس کو بعض ناقدین، آثار کہولت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ تعبیر خواہ کچھ بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسندی کے بوسیدہ آثار پر ایک اور تازہ اور جدید ادبی و شعری عمارت وجود میں آ گئی۔ جہاں ترقی پسند سے انحراف تھا تو دوسری طرف نئے موضوعات اور نئے اسالیب کی رنگارنگی بھی تھی۔ لب و لہجہ بالکل نیا نیا اور تازہ کار تھا۔

بہار میں جدید اردو شاعری کی روایت کا آغاز بھی انہیں خصوصیات کے ساتھ ہوا۔ جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، اختر قادری اور پرویز شاہدی کے ہاتھوں اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ ان شعرا نے جدیدیت کا اتباع نہیں کیا لیکن موضوعات اور اسلوب کی سطح پر ان کے یہاں جدت بہر حال موجود تھی۔ ان کے بعد کے شعرا میں اختر پیامی، مظہر امام، احسان دربھنگوی، جاوید منظر شہاب، انیس امام، حسن نعیم اور احمد عظیم آبادی وغیرہ بھی اسی کوچہ کی جانب رواں نظر آتے ہیں لیکن ان کی متاع سفر میں ترقی پسندوں کی باقیات اس طرح شامل ہیں کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کا تضاد یا تصادم کھل کر سامنے نہیں آتا۔

بہار کے جدید شاعروں نے اپنے پیش روؤں سے الگ راہ اپنائی اور کسی خاص نقطۂ نظر اور تحریک کو اپنائے بغیر آزادانہ طور پر جدیدیت کے رجحان کو فروغ دینے میں سرگرم رہے۔ علامت، رمزیت، ایمائیت کو قبول کیا گیا اور نئے عہد کی حسیت کو اشعار کے وسیلے سے پیش کیا گیا۔ بہار

کے جدید غزل گویوں نے سیاسی ونظریاتی انقلابات اور سماجی تغیرات سے کم ہی واسطہ رکھا۔ ذات کا کرب، محرومی، یاس، حرماں نصیبی اور زیاں کا احساس شدت سے ابھرا اور یہ احساس، خیال افروز بن گیا کیونکہ یہ حقیقت ان کے سامنے تھی کہ جو ادب خیال افروز ہوگا وہ زندگی کے میدان میں پیش قدمی کا محرک ثابت ہوگا۔ زندگی کی بے مقصدیت، غیر محفوظیت، بے معنویت کو جدید انسان کا مقدر تصور کرکے انسان کی داخلی الجھنوں اور مشکلوں کو آشکار کرنا ازحد لازمی سمجھا گیا۔ جدید شاعروں کا خیال تھا کہ موجودہ حالات میں تمناؤں اور آرزوؤں کی وہ تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں، جن پر چل کر انسان راحت، سکون اور مسرت کے خوش کن لمحات سے زندگی کو جینے کے لائق بنا سکتا ہے۔ ان احساسات کو مختلف شعرا نے اپنے اپنے طور پر پیش کیا ہے۔ جیسے یہ اشعار:

سورج چمک رہا ہے سوا نیزے پر یہاں
اس دشتِ کربلا سے کہیں بھاگ جایئے — سید احمد شمیم

یہ دھواں سا اپنے چاروں اور ہے کیوں رات دن
جسم کے اندر کہیں ہم درد سے جلتے تو نہیں — وہاب دانش

وہ بے جہت کا سفر تھا سوادِ شام نہ صبح
کہاں پہ رہتے، کہاں یادِ رفتگاں کرتے — مظہر امام

روز و شب بے کیف تھے، شام تھی سوئی ہوئی
شہر کی آنکھوں میں تھی بے منظری بوئی ہوئی — شاہد کلیم

ہر لمحہ ٹوٹتا ہوا اک اضطراب تھا
اپنا وجود اپنے لیے اک عذاب تھا — عین تابش

یہ اشعار پہلوں کے لہجوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں رسمی اور روایتی باتوں کی تکرار سے اجتناب برتا گیا ہے۔ روایتی مضمون آفرینی، خیال آفرینی اور معاملہ بندی کی جگہ ایک ایسی فکر ہے جو نئی تازگی سے ہم کنار کرتی اور حقیقی زندگی سے قریب بھی کرتی ہے۔ درج بالا اشعار محض تفنن طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ تلخ حقائق اور نامساعد حالات سے روشناس کرتے ہیں۔ ان اشعار میں ذات وکائنات کے ربط وضبط کی نئی سطحیں نمودار ہوتی نظر آتی ہیں اور جہاں زمان ومکاں بدلے بدلے نظر آتے ہیں۔ ان

میں تجربات اور مشاہدات کی تلخیاں بھی ہیں اور فرد کی ذات میں برپا ہونے والے انتشارات بھی ہیں۔

اب چند اور اہم جدید شعرا کے اشعار ملاحظہ ہوں:

تمام عمر یونہی ٹوٹنا بکھرنا ہے
یہ طے ہوا کہ ہمیں قسط وار مرنا ہے — سلطان اختر

زمیں یہ آگ اُگلنے لگے تو کیسا ہو
ہر ایک شہر جو جلنے لگے تو کیسا ہو — پرکاش فکری

مت پوچھ کہ اندر سے میں کیوں ٹوٹ رہا ہوں
آئینہ کبھی اپنی صفائی نہیں دیتا — صدیقی مجیبی

ایک اک چہرے پہ لکھا ہے شکستوں کا حساب
اس گھنی بھیڑ میں اک ایک نظر ہے تنہا — لطف الرحمٰن

اب ہوں لہولہان تو حیرت نہ کیجیے
ان پتھروں میں آئینہ بردار میں ہی تھا — لطف الرحمٰن

وہ حادثہ جسے چاہا کہ بھول جاؤں میں
مرے گمان و یقین سے بعید نہ ہوگا — ظہیر صدیقی

ان اشعار سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ اپنے ماقبل کی آوازوں سے منفرد اور نئی آوازیں ہیں۔ یہاں شاعری کی بامعنی اور نتیجہ خیز شبیہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ عصری شعور اور نئی حسیت سے معمور یہ اشعار اردو کی جدید شاعری کی شناخت اور بازیافت ہیں۔ مذکورہ شعرا کے علاوہ بہار میں جدید شاعری کے اہم ناموں میں شمیم فاروقی، ظہیر غازی پوری، صبا اکرم، شاہد احمد شعیب، ثوبان فاروقی، شام رضوی، ظہیر انور، شاہین بدر، قیصر صدیقی، اسلام پرویز، محبوب انور، شمیم قاسمی اور خورشید طلب کے نام بھی آتے ہیں۔ ان شعرا نے غزل کو نئے رنگ و آہنگ سے آراستہ کیا اور معاصر جدید شاعری میں بہار کو نمایاں کرکے اردو دنیا میں پیش کیا۔

بہار میں حسن نعیم اور مظہر امام کے بعد جدید شعرا میں لطف الرحمٰن، علیم اللہ حالی، سلطان اختر، پرکاش فکری، صدیق مجیبی، ظہیر صدیقی، وہاب دانش اور شمیم فاروقی وغیرہ کے نام ہندوستان

گیر سطح پر لیے جاتے رہے ہیں۔ان میں علیم اللہ حالی، وہاب دانش اور ظہیر صدیقی نے نظموں کو بطور خاص وسیلۂ اظہار بنایا جب کہ لطف الرحمٰن، سلطان اختر، صدیق مجیبی، پرکاش فکری اور شمیم فاروقی نے غزلوں کے ذریعہ اپنے محسوسات کو عیاں کیا۔

اس ضمن میں معروف جدید شاعر مرحوم شاہد کلیم نے جدید شاعری اور بہار کے جدید شاعروں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پرانی غزل زیادہ تر جہاں خارجی مظاہر اور مسئلے کا مطالعہ پیش کرتی ہے وہیں نئی غزل شاعر کے اندرون ذات میں اتر گئی اور اس کی شخصیت کے گونا گوں اور مختلف پہلوؤں کا مطالعہ اس انداز سے پیش کرنے لگی کہ خارجی دنیا کے رنگا رنگ مظاہر بھی اس کی ذات سے ہم آہنگ ہو گئے۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نئے شعرا کے یہاں نہ صرف باطن کی دنیا سے ہی موضوع کے اخذ و اکتساب کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے بلکہ خارج کی دنیا سے بھی مواد حاصل کر لینے کا رجحان عام نظر آتا ہے''۔ (بہار میں جدید غزل، ڈاکٹر عطاء اللہ خاں، ص ۱۱)

شعرا کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے شاہد کلیم یوں رقم طراز ہیں:

''......لطف الرحمٰن کے یہاں حیات و کائنات کے مابین ہم آہنگی اور ربط و معنی کی تلاش کا سلسلہ نہ ان کی ذات تک ہی پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور نہ ان کی ذات کے درونِ خانہ سے گزر کر کائنات کی روح میں سمٹ جاتا ہے بلکہ وہ لامحدود آسمان کی طرف مڑ جاتا ہے۔اس طرح ان کے پیش نظر صرف ذات اور ذات کی کرب ناکی کا بھی منظر نامہ نہیں بلکہ ایک وسیع و عریض ارضی و سماوی کینوس ہے، جس پر روزمرہ کے مشاہدات و تجربات کے ذریعہ مختلف زاویوں سے حیات و کائنات کی رنگ برنگی تصویریں بنانے میں وہ مصروف ہیں۔

سلطان اختر کی شاعری مایوسی اور ناکامی کا مکمل منظر نامہ نہیں۔دراصل ان کی شاعری رجائیت اور امکانات سے معمور ہے اور یہی رجائی پہلو ان کی شاعری کا وہ بنیادی وصف ہے جو انہیں جدید شعرا کے درمیان ایک ممتاز مقام تفویض کرتا ہے۔صدیقی مجیبی کی غزلیں نہ تو جدید ہیں اور نہ ترقی پسند بلکہ دونوں کے انضمام سے ایک تیسری چیز عالم وجود میں آتی ہے۔اس طرح ان کی آواز نہ تو ناصر کاظمی اور شہریار کی طرح دھیمی ہے اور نہ ہی ترقی پسند شعرا کی طرح تیز۔

پرکاش فکری کے یہاں ایک طرف جہاں موضوعات میں تنوع ہے وہیں پیکر کا بھی انتظام و انصرام ہے۔حقیقتاً ان کی شاعری کسی ایک نقطہ پر مرتکز نہیں بلکہ مختلف موضوعات پر روشنی ڈالتی ہے۔مظاہر فطرت کے خدوخال سے تحصیل مسرت کا رجحان علیم اللہ حالی کے یہاں بڑا واضح ہے۔اس طرح مظاہر فطرت سے ان کی یہ دلچسپی صرف ان کے احساس جمال کی ہی غماز نہیں بلکہ ان کے شعور ذات اور شعور کائنات کا بھی ادراک بخشتی ہے''۔ (بہار میں جدید غزل، ڈاکٹر عطاء اللہ خاں، ص۲۲)

ان شعرا کے علاوہ ظہیر غازی پوری، شمیم فاروقی، منیر سیفی، رونق شہری، شمیم قاسمی، شاہد جمیل وغیرہ نے بھی جدیدیت سے متاثر ہوکر نئے عہد کو نئے سیاق وسباق میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے جب حالات بدلتے ہیں تو لب و لہجے اور انداز و اسلوب میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ان شعرا کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہار میں نئی شاعری کو پروان چڑھانے میں انہوں نے قابل قدر کاوشیں پیش کیں۔جدیدیت کا شوروغل ممکن ہے تھم سا گیا ہو لیکن جدت اور ندرت کے عناصر تو فطرت کا تقاضا ہیں اسی لیے اکثر شعرا اپنی اسی پرانی روش پر قائم ہیں۔فرق اتنا ہے کہ بہار میں جدیدیت کی آمد کے بعد جو ابہام و ایہام اور اغلاقی اسلوب شاعری اور افسانے میں آگیا تھا۔اس کے بادل چھٹ چکے ہیں۔

۱۹۸۰ء کے بعد اردو شاعری میں ایک اور موڑ آیا ہے۔اسے بعض لوگ مابعد جدیدیت کا نام دیتے ہیں۔۱۹۸۰ء کے بعد کے عہد کو کچھ نئے شعرا نے خود جوازیت اور خود افکاریت کا نام بھی دینا چاہا لیکن یہ اصطلاحیں مستعمل نہ ہوسکیں۔حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت کے بعد جو شعرا منظر نامہ پر آئے ان کے یہاں بھی جدیدیت کا رنگ اسی طرح جھلکتا ہے جس طرح ترقی پسندی اور جدیدیت کے دھاروں کے ملنے پر سامنے آیا تھا۔اس سلسلے کے شعرا میں عالم خورشید، خورشید اکبر، راشد طراز، طارق متین، خورشید طلب، منظر سلطان، سرور ساجد اور راشد انور راشد کے نام ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ زندگی کو سمجھنے اور اسے برتنے کا سلیقہ ان کا اپنا ہے۔ان کے یہاں کوئی کمٹمنٹ نہیں بلکہ وہ معروضی اور آزادانہ طور پر افہام و تفہیم کی راہ روشن کرتے ہیں۔ان کے یہاں وہ سارے اوصاف موجود ہیں، جو موجودہ معاشرہ کو آئینہ کرنے کے لیے ضروری ہیں لیکن وہ معاشرے

کے ترجمان ہوتے ہوئے بھی اپنی ذات سے اتنے ہی زیادہ قریب ہیں جس طرح جدیدیت سے متاثر شعرا قریب تھے۔لیکن بہ انداز دیگر۔ نئے شعرا کے یہاں نئی لفظیات بھی خالص اپنے گرد وپیش کی ہے،۸۰ء کے بعد کے شعرا میں ایجاز واختصار کے ساتھ اپنے موقف کے اظہار کا بہترین اسلوب بھی موجود ہے۔ان شعرا میں مذکورہ بالا ناموں کے علاوہ خورشید سحر، جمال اویسی، نعمان شوق، شاہد اختر، قربان آتش، قیصر جمال، معراج رعنا، خالد عبادی، عطا عابدی، اطہر نیراور کوثر مظہری کے نام بھی شمار کیے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عہد در عہد شاعری کی طرح بہار میں جدید شاعری کی عمارت بھی بہت مستحکم اور روشن رہی ہے۔اس شاعری میں اپنے عہد کا خوف وتشکیک، مایوسی، محرومی، کرب واضطراب، انتشار ذات، تنہائی اور غیر محفوظیت کا احساس نمایاں ہے۔ یہ بنیادی رجحانات بہار کے تقریباً تمام جدید شعرا کے یہاں بہ آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔خوبی یہ ہے کہ ایک طرح کے موضوع اور اسلوب کے باوجود کسی طرح کا ادغام نظر نہیں آتا۔ یہ بہار کے جدید شاعروں کا امتیاز ہے۔ان جدید شعرا کے اسلوب اور فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہنوز لکھا جارہا ہے۔بطور مثال ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے، جس سے بہار میں جدید شاعری کے نقوش اور جدید شعرا کی کاوشیں روشن ہوکر سامنے آتی ہیں:

> ”حقیقت یہ ہے کہ ہر نیا شاعر ایک خاص لب ولہجہ وضع کرتا ہے، ایک خاص زبان تراشتا ہے اور نئے نئے اشعاروں، نئی نئی تشبیہوں اور نئی نئی علامتوں کے ذریعے اپنے خیالات ومحسوسات کا اظہار اپنے طور پر کرتا ہے۔ اظہار کی یہ نجی خصوصیت ہی نئے شعرا کا طرۂ امتیاز ہے اور نئی شاعری کی پہچان ...... یہی وجہ ہے کہ آوازوں کی بھیڑ میں بھی مختلف آوازوں کی شناخت منفرد لب ولہجہ کے سبب کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ تمام شعرا اگرچہ مختلف عہد کی پیداوار ہیں لیکن ایک ہی ادب سے وابستہ ہونے کے باوجود منفرد لب ولہجہ کے سبب الگ الگ اپنے نقوش ثبت کرتے ہیں“۔ (بہار میں جدید غزل، ڈاکٹر عطاء اللہ خاں، ص ۲۷)

درج بالا اقتباس کی روشنی میں ہم بہار کے نئے شعرا کے یہاں ہر طرح کی ندرت اور جدت کا احساس کرتے ہیں اور یہ وہ امتیازی وصف ہے جو بہار میں جدید شاعری کی روایت کو معتبر اور مستحکم بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

چنئی میں رابطۂ ادب اسلامی کا سمینار

عمیر الصدیق ندوی

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سمینار کی اطلاع ملی کہ یہ ۱۹؍۲۰؍جنوری کی تاریخوں میں چنئی (مدراس) میں منعقد ہوگا اور یہ کہ اس کا موضوع انسانیت کی خدمت میں مختلف اصناف ادب کا حصہ ہے، دعوت نامہ میں یہ اشارہ بھی صاف تھا کہ اصناف ادب میں مقالہ افسانہ، خطبہ، ناول، ڈراما اور صحافت کا شمار بھی ہے۔

رابطہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام ہر سال ایک سمینار ضرور ہوتا ہے اور اس کی میز بانی کسی نہ کسی شہر کے نصیب میں آتی ہے۔ یہ اس کا چونتیسواں سمینار تھا یعنی قریب تیس سال سے یہ برصغیر میں اردو ادب کے ماضی و حال کی روشنی میں ان جہتوں کی یافت و تلاش و پیش کش میں سرگرم سفر ہے جو انسان کو اس کی اصل اور مقصود منزل کا پتہ دیتی ہیں، زندگی اور ادب کے تعلق سے اردو کی محفل میں ایسے دور آتے رہے جہاں مے بھی اور رہی اور جام و جم بھی۔ اگر تہذیب کے آزر نے کچھ صنم تراشے تو وہیں خلیلی یقین نے اپنے حرم بھی تعمیر کیے۔ رابطہ ادب اسلامی بھی اسی تعمیر کی ایک کڑی ہے۔ اعلیٰ اور پاکیزہ ادب کی تخلیق و توسیع میں اس کی کامیابی و ناکامی کا جائزہ یا فیصلہ نقادوں کا کام ہے تاہم سیر و سوانح، تذکرہ، ملفوظات، مکتوبات اور نثر و شعر کی ترجیحات کے مختلف اور متنوع موضوعات کا محور انسانیت کی خدمت ہی رہا، اور مدراس میں تو اصل عنوان ہی یہی تھا۔

مدراس کی ایک قدیم تنظیم انجمن حمایت الاسلام کے تعاون سے یہ سمینار ہوا اور مقالہ نگاروں اور سامعین کی کثرت اور بعض عمدہ مقالات و خطبات کی وجہ سے یہ یادگار بھی بن گیا۔

یادگار اس لیے بھی کہ رابطہ کے سمینار ملک کے مختلف شہروں میں اور بعض شہروں میں کئی بار ہوئے لیکن مدراس خدا جانے کیوں اب تک اس فہرست میں شامل نہ ہوسکا تھا۔

سمینار کے ذریعہ اس کمی کی تلافی ہوئی اور خوب ہوئی، ایک نوتعمیر خوبصورت عمارت میں اس کے باوقار اجلاس ہوئے، معلوم ہوا کہ یہ نئی تعمیر جلد سے جلد اسی لیے مکمل کی گئی کہ اس کا آغاز ہی انسانیت کی خدمت کے اسلامی پیغام سے ہو، اس عمارت کا باقاعدہ افتتاح مولانا سید محمد رابع ندوی صدر رابطہ ادب اسلامی کے دست مبارک سے ہوا، افتتاحی جلسہ میں چنئی بلکہ ارض جنوب کی غالباً تمام ممتاز شخصیتیں موجود تھیں، انجمن حمایت الاسلام کے سکریٹری جناب ٹی رفیق احمد نے خیر مقدمی کلمات میں اور مولانا الیاس بھٹکلی ندوی نے استقبالیہ خطبہ میں اس خطۂ مجمع البحرین کے ماضی وحال کی ایسی تصویریں پیش کردیں جو حسرت وحیرت اور کسی حد تک مسرت کا احساس دلاتی رہیں۔ اسٹیج پر پرنس آف آرکاٹ کی موجودگی یاد ایام یا گردش ایام کے جذبوں کو مہمیز کررہی تھی کہ ع لوٹ پیچھے کی طرف......۔

اس دوروزہ سمینار میں لکھنؤ، علی گڑھ، بھوپال، ممبئی، حیدرآباد، جے پور، کولکاتہ، آگرہ، رامپور، پونا، آکولہ، اجین جیسے شہروں کے نمائندے زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ دھوم تو اب بھی اپنی زباں کی ہے۔ بنگلور، بھٹکل تو گویا میزبان ہی تھے۔ سمینار میں نامور فضلا اور دانشوروں کے ساتھ نوجوان لکھنے والوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ قریب ۷۰-۸۰ مقالات تھے، مقالات کا معیار ظاہر ہے یکساں نہیں ہوتا لیکن ضیافت میں جنوبی ہند کی روایات کا خوب سے خوب تر مظاہرہ ہوتا رہا۔ اکثر مہمانوں کی رہائش کا انتظام حج ہاؤس کی عظیم الشان عمارت میں تھا۔ ٹی رفیق احمد صاحب اور خاص طور پر ان کے دو رفقائے کار احسان الرحمٰن اور تبریز پاشا کسی روبوٹ کی طرح ہردم رواں اور متحرک نظر آئے۔ سمینار میں ایک شعری نشست نے دہلی ولکھنؤ کا سماں پیش کردیا، خاص طور پر حسن فیاض صاحب کے اشعار اور ترنم عرصہ تک سامعین کو ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

ہمارے لیے چنئی یا مدراس مرحوم کی زیارت کی وجہ سمینار ضرور تھی لیکن کشش کا سبب یا اسباب کچھ اور بھی تھے۔ مدراس کی شہرت میں شک نہیں لیکن ہمارے نزدیک مدراس کو اردو کی

علمی و مذہبی دنیا میں جو شہرت، خطبات مدراس کے ذریعہ حاصل ہوئی، اس کی مثال شاید ہی کوئی اور مل سکے۔ آج سے قریب نوے سال پہلے ۱۹۲۵ء میں جب مدراس کے سیٹھ ایم جمال محمد کی علم نوازی کی بدولت مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا نے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کو سیرت نبویؐ پر چند خطبات کے لیے مدعو کیا تو کہا گیا کہ مدراس نے اپنے نوجوان فرزندوں کو خطبات اسلامیہ کے ذریعہ مذہب سے واقف کرانے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ یقیناً ہندوستان کے صوبوں میں اسلامی تعلیمی انجمنوں کا اس راہ میں پہلا قدم ہے، پہل اور اولیت کا صرف یہی فخر مدراس کو حاصل نہیں ہوا، تاریخ نے بتایا کہ مدراس کی سرزمین ہی پر اسلام کی شعاعیں سب سے پہلے پڑیں یعنی جب ہندوستان کے کسی گوشہ میں اسلام کے کسی سپاہی کا قدم نہیں پڑا تھا تو ایک روایت کے مطابق اور مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں معجزہ شق القمر کی روشنی تھی جو بحر عرب سے گزر کر بحر ہند کے اس ساحل تک پہنچی اور دلوں کو روشن کرگئی۔ سید صاحب مدراس پہنچے تو اس حقیقت کے باوجود کہ جنوب ہند کے مسلمانوں کی زبان گرچہ اردو نہیں، انہوں نے دیکھا کہ مدراس میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نظم و نثر اردو میں شمالی ہند کے لوگوں سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر مدرسہ جمالیہ اور ویلور کے مدرسہ باقیات صالحات اور عمرآباد کے دارالسلام کے تعلیمی نخلستان نظر آئے تو سید صاحب نے اردو کی جغرافی وسعت کا اعتراف کیا، خطبات مدراس ہی کی طرح سید صاحب کا قلم تاثرات مدراس میں یہ خوش خبری سناتے ہوئے سرشار نظر آیا کہ سیرت النبیؐ کا ترجمہ تامل زبان میں ہو رہا ہے اور اردو تامل کے ایک اچھے ادیب محمد علی صاحب ملک نے سیرت کی دونوں جلدوں کا ترجمہ کرلیا ہے، یہ ملک صاحب علامہ شبلی کے بڑے معتقدوں میں تھے اور ان سے ملنے ندوہ بھی آئے تھے۔ مدراس والوں کی مالی و علمی، حوصلہ مندیوں کو دیکھ کر سید صاحب نے شمال والوں سے یہی گذارش کہ کی ''اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو مدراس جایئے۔ خود سید صاحب دوسال بعد ۲۷ء میں دوبارہ مدراس تشریف لے گئے تو مدراس، ویشارم آمبور، عمرآباد، وانمباڑی اور آرکاٹ کو دیکھ کر خوش ہوئے کہ ''بحمد للہ ہر جگہ مسلمانوں کو ہشیار اور بیدار پایا'' سید صاحب نے اور کیا کیا دیکھا اس کی تفصیل کے لیے معارف کے شذرات کی سیر چاہیے۔ یہاں ان اشاروں سے مقصود صرف اتنا ہے کہ نوے سال کے بعد مملکت

سلیماں کے ایک مورناتواں کا گزر جب اسی راہ سے ہوا تو دل پر کیا گزری، مدراس کی راہوں پر گزرتے ہوئے، وہاں کی فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے خطبات مدراس کے حرف وصوت کا لمس محسوس ہوا، علامہ اقبال کے مشہور خطبات الٰہیات کی تشکیل جدید، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مارماڈیوک پکتھال کے خطبات قرآنی یاد آئے تو جیسے پورا مدراس منبر ومحراب میں بدل گیا۔ ایک جذباتی لمحہ وہ بھی تھا جب سمینار کے افتتاحی جلسے میں بتایا گیا کہ مسند صدارت پر عبدالعلی صاحب بھی ہیں جو پرنس آف آرکاٹ ہیں اور یہ سراج الحق صاحب ہیں جو اپنے وقت کے مشہور افضل العلماء ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے حفید سعید ہیں۔ آرکاٹ کے والا جاہی نوابین کی تاریخ سامنے آگئی۔ اسلامی تہذیب وثقافت کی تاریخ میں علم نوازی ومعارف پروری کی چند نہایت دلکش داستانوں میں آرکاٹ کا ذکر اور نمایاں ذکر ناگزیر ہے۔ ملا بحرالعلوم اور باقر آگاہ نے اسی آرکاٹ کو ناقابل فراموش بنادیا۔

نوے سال پہلے کا یہ خطہ اتنا ضرور بدلا کہ مدراس چنئی ہوگیا اور پورا صوبہ کرناٹک اور آندھرا کے باقیات کو لے کر تامل ناڈو ہوگیا، انگریز اور پرتگالیوں کے اثرات کو ظاہر کرنے والی عمارتیں اب جدید تعمیرات کے سامنے کچھ ماندسی پڑ گئیں، لیکن اپنے مذہب اور علم اور صنعت سے وابستگی بلکہ شیفتگی کی روایتیں اب بھی قائم ہیں اور کہیں کہیں وہ پہلے سے زیادہ تابدار بھی نظر آتی ہیں۔ ایک وسیع خطہ پر انجمن حمایت الاسلام کے تعلیمی ادارے اور نہایت خوبصورت مسجد اور مثالی نظم وضبط کے نظاروں اور جناب ٹی رفیق اور ان کے رفقاء نے اس تابندگی کو کم نہیں ہونے دیا جس کا مشاہدہ کبھی سید صاحبؒ نے سیٹھ یعقوب حسن اور سیٹھ جمال محمد اور مدرسہ جمالیہ میں کیا تھا۔ علامہ شبلی اور ندوہ کے پیغام پر سب سے پہلے مدراس نے لبیک کہا تھا، مجلس علمائے جنوبی ہند کی بنیاد اسی آواز کا نتیجہ تھی۔ آج بھی اسی آواز کی بازگشت ہے۔ جس کا سب سے قابل تحسین نمونہ عمرآباد کا تعلیمی ودعوتی ادارہ دارالسلام ہے، اس کے بانی کاکا عمر کے ذکر سے دارالمصنّفین اور معارف سے غافل نہیں رہے۔ دارالسلام ہی کیا پورا عمرآباد جو اچھا خاصا قصبہ ہے یہ ایک فردِواحد کی تمناؤں کا جلوہ گاہ ہے۔ آمبور کے قریب یہی وہ پہاڑی دامن ہے جہاں حیدرآباد، آرکاٹ اور میسور کی وہ لڑائی ہوئی جس کا ذکر نہ کیا جانا ہی بہتر ہے۔ سید صاحب نے اپنے خاص اسلوب

میں لکھا کہ اب یہ صلح کا میدان ہے، مسلمانوں کے مسلکی تعصّبات، اصلاح، رد بدعات اور صحت عقیدہ کے پس منظر میں "صلح کے میدان" کی معنویت آج بھی برقرار ہے، جنگ کے میدان کو دارالسلام میں بدلنے کا عمل اتنا آسان نہیں۔ کوہ و کمر آباد کرنے کے لیے صرف اور صرف جذبۂ عشق مطلوب ہے۔ عمر آباد کے کاکا عمر سے کاکا سعید اور ان کے فرزند سعید کاکا انیس سے مل کر اسی ایمان کی تجدید ہوئی، عالی شان کتب خانہ میں سلیقہ سے سجی کتابیں اور ان میں معارف کی فائلوں اور کتابوں کو دیکھ کر جی خوش ہوا۔ دارالسلام دیکھنے کی دیرینہ خواہش پوری کرنے میں ہم آرکاٹ، ویلور، آمبور سے گزرتے رہے، سبز پوش کوہساروں، ناریل کے باغوں اور تاحد نظر شاداب نظاروں کو دیکھ کر ان روایتوں پر یقین کرنے کو دل چاہا کہ بابا آدمؑ جنت سے نکلے تو اسی سرزمین پر اتارے گئے جو ان کو جنت کی یاد دلاتی رہے۔ دارالسلام میں کاکا سعید صاحب اور مدرسہ کے مجسم محبت مہتمم اور مدرسین نے ذرا سے وقت میں طلبہ سے گفتگو کرنے کا موقع بھی فراہم کردیا۔ چشم تصور میں اسی مدرسہ میں حضرت سید صاحب کے استقبال اور تقریر کا منظر پھرنے لگا۔ قرب قیامت کی علامتیں بہرحال ظہور میں ہیں۔ عمر آباد، آرکاٹ اور مدراس کا یہ سفر دیکھا جائے تو کھوئے ہوؤں کی جستجو ہوگیا جہاں قدم قدم پر دل و دماغ کی دنیا میں ایک ہی گونج تھی کہ

ع جانے اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

ماضی کے ان دھندلکوں میں مولانا یوسف کوکن اور مولانا ابوالجلال ندوی یاد آئے کہ دارالمصنّفین اور خطہ جنوب کے روابط کی یہ مضبوط ترین کڑیاں تھے اور ہاں قاری قاسم بھوپالی انصاری مرحوم کا سراپا بھی تھا جو ندوہ اور دارالمصنّفین کے شیدائی تھے، جنھوں نے مدراس کی سب سے مشہور مسجد میں برسوں اپنے درس قرآن سے قرآن مجید کے پیغام کو عام کیا۔ ان کی مسجد میں حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی کی تقریر سے قاری صاحب کی روح بھی شاد ہوئی ہوگی۔

اخبار علمیہ

''عالمی آن لائن کتب خانہ''

یونیسکو نے نیچر ایجوکیشن اور ایک اور ادارہ کے تعاون سے ایک عالمی آن لائن کتب خانہ شروع کیا ہے جس کا مقصد ترقی پذیر ممالک میں طلبہ کو کتب بینی ومطالعہ کے مساوی مواقع کی فراہمی، معیار تدریس کی ترقی اور ذرائع تعلیم وتعلم کی توسیع ہے۔انٹرنیٹ صارفین اس کو مفت استعمال کریں گے۔اس میں سائنسی موضوعات پر ہونے والی جدید ترین تحقیقات، مطالعے اور سائنسی رسائل وجرائد ہوں گے۔اس کا افتتاح عالمی سائنس ڈے ۲۰۱۴ء برائے امن وترقی کے موقع پر کیا گیا ہے۔اس میں تین سو سے زائد سائنسی جرائد میں شائع ہونے والے مضامین، ۱۲۵ ای بکس اور ۷۰ سے زیادہ ویڈیوز رکھے گئے ہیں، اس کے علاوہ اس کے ویب پورٹل کی مدد سے طلبہ گروپ بنا کر اساتذہ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔اس لائبریری کے ذریعہ ترقی یافتہ اور پس ماندہ ممالک کے طلبہ کو یہ موقع فراہم کیا گیا ہے کہ وہ باہم اپنے تجربات منتقل کر کے ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں۔واضح رہے کہ یونیسکو دنیا بھر میں علم کی بنیاد پر ثقافتوں کی ترویج کے لیے کام کرنے والا ادارہ ہے۔اس کی قائم کردہ یہ آن لائن لائبریری جہاں طلبہ وسائنس دانوں کے درمیان باہمی ربط وتعلق کو مستحکم بنائے گی وہیں مختلف مذاہب ونظریات کے حامل افراد کے مابین فکری بحث کو فروغ ملے گا اور غلط فہمیوں کی خلیج بھی کم ہوگی۔اس لائبریری کا آن لائن پتہ حسب ذیل ہے:

www.unesco.org/library/

''Prism جیسے آلہ کی ایجاد''

کمپیوٹر میں معلومات کی منتقلی کے لیے بجائے تاروں کے روشنی استعمال کی جاسکتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق اسٹینفورڈ یونیورسٹی کے محققین نے Prism جیسا ایک آلہ تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے جو روشنی کی ایک موج کو مختلف رنگوں میں بانٹ سکتا اور روشنی کو کسی خاص

زاویہ پر موڑ بھی سکتا ہے۔اس کامیابی کے نتیجہ میں ایسے کمپیوٹر کی ایجاد ممکن ہو جائے گی جو معلومات کو منتقل کرنے کے لیے بجلی کے تار کے بجائے بصریات کا سہارا لے گا۔اس تجربہ میں بصری رابطہ یعنی سلی کون (Silicon) کے چھوٹے سے ٹکڑے کا استعمال کیا گیا،جس میں بارکوڈ کے مانند معلومات درج تھیں۔ جب اس رابطہ پر روشنی مرتکز کی گئی تو وہاں سے دو مختلف موجوں کی روشنیاں خارج ہو کر بالکل درست زاویہ بناتے ہوئے ریسیور تک T کی شکل میں پہنچ گئیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تار کے مقابلہ میں روشنی زیادہ معلومات منتقل کرسکتی ہے اور الکٹرون کی بہ نسبت ٹوٹو ان کے اخراج میں توانائی کا استعمال بھی کم کرتی ہے۔ (سائنس،جنوری ۲۰۱۵ء،ص ۳۴)

''دمدار ستارہ پر ''فائلی'' کی لینڈنگ''

امریکی اور یورپی سائنس دانوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک خلائی روبوٹ زمین سے ۵۰ کرور کلو میٹر دور ایک دمدار ستارے کی سطح پر کامیاب اترا۔''فائلی'' نامی یہ روبوٹ روزیٹا خلائی جہاز سے الگ ہوا اور اس نے تصویریں کھینچ کر بھیجی۔ محققین کے بیان کے مطابق اس کا مقصد نظام شمسی کے تشکیلی وترکیبی رازوں سے پردہ اٹھانا ہے۔سائنس دانوں کا خیال ہے کہ سیاروں پر پایا جانے والا پانی دمدار ستاروں ہی سے آیا ہے اور ان میں زندگی کے لیے درکار بنیادی مادے موجود ہیں جن کی مدد سے زمین پر زندگی وجود میں آئی اور یہ ستارے سورج کے گرد ساڑھے چار ارب سال سے یعنی جب نظام شمسی وجود میں آیا ہے گردش کررہے ہیں۔ (تعمیر فکر،نومبر و دسمبر ۲۰۱۴ء،ص ۳۳)

''تین کلو وزنی واشنگ مشین''

میکینکل ڈیزائن کے ایک ۲۱ سالہ چینی طالب علم پوکنگ لیانگ نے تین کلوگرام وزنی ایک ایسی واشنگ مشین تیار کی ہے جس میں بیک وقت پانچ کپڑے دھوئے جاسکتے ہیں۔اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کو ایک تھیلی میں تہہ کرکے رکھا جاسکتا ہے،لیانگ کے بیان کے مطابق اس کو یہ خیال اپنے کمرہ کے ساتھی کی کپڑے دھونے کی پریشانی دیکھ کر آیا اور ارادہ کیا کہ کیوں نہ

تہہ کرنے والی واشنگ مشین بنائی جائے ۔ چنانچہ اس نے اس کے بعد مختلف میکینکل ڈیزائن دیکھے اور پھر اس سلسلہ میں انٹرنیٹ کے عام صارفین سے پوچھا کہ کیا وہ اس قسم کی مشین خریدنا پسند کریں گے ۔ اچھی خاصی تعداد نے مثبت جواب دیا ۔ اب بڑی تجارتی کمپنیوں نے بڑے پیمانے پر اس سے رابطہ کیا ہے ۔ (عرب نیوز)

''برج خلیفہ کا شاندار مظاہرہ''

۲۰۱۵ء کی شب سال نو کی آمد پر دنیا کی بلند ترین عمارت برج خلیفہ کو ۷۰ ہزار ایل ای ڈی برقی قمقموں سے بقعہ نور بنا دیا گیا ۔ دور دور سے آئے ہوئے سیاح اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے ۔ ۸۲۹.۸ میٹر بلند اس عمارت نے اپنی عظمت و کشش میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈس کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ ڈالے ۔ برج کے اطراف کا ۳۲۴۶۷ مربع میٹر کا علاقہ بھی منور کیا گیا تھا ۔ اس علاقہ میں ۷۰ ہزار ایل ای ڈی بلب کے علاوہ ایک لاکھ سے زیادہ بریکٹس اور ۵۵ ہزار میٹر کیبلنگ کی گئی تھی ، مختلف زاویوں سے نصب کردہ چار کیمروں کے ذریعہ اس مظاہرہ کو لائیو ٹیلی کاسٹ بھی کیا گیا ۔ ۳ ڈرون طیاروں سے اس پورے منظر کی عکاسی بھی کی گئی جس کو دنیا بھر کے کروڑوں لوگوں نے دیکھا ۔ آتش بازی میں لیزر شو کا بھی اہتمام کیا گیا تھا ۔ رپورٹ کے مطابق اس کے لیے ۷ء۴ ٹن پٹاخے استعمال کیے گئے ، اس میں دنیا کی انتہائی پیپر ٹیکنکس کا استعمال کیا گیا تھا ۔ احمد المطر وشی کے بیان کے مطابق رنگ و نور کی جاذب نظر اور پرکشش تقریب آنے والے بہتر کل کی امیدوں اور مسرتوں کو اپنے ساتھ لائی ہے اور دبئی کے ایک نئے دور کا یقین دلاتی ہے ۔ (منصف ، ۲؍جنوری ۲۰۱۵ء ، صفحہ اول)

ک ، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

۴؍اکتوبر ۱۴ء

مکتوب رانچی

محبّ مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

ہندوستانی مسلمانوں پر دشمنان اسلام آئے دن جس طرح دہشت گرد وغیرہ کا بے بنیاد الزام لگاتے رہتے ہیں اب قدیم نالندہ یونیورسٹی (بہار) بقول سوامی دھرم تیرتھ جسے ملک کی برہمنزم نے منصوبہ بند انداز میں نہ صرف بدھوں کا قتل عام کر کے ملک بدر کر دیا بلکہ اس قدیم یونیورسٹی کو بھی تباہ و برباد کر کے کھنڈر بنا دیا۔ اب جب کہ سابق صدر جمہوریہ اے، پی، جے عبدالکلام صاحب کی تجویز پر ایک یونیورسٹی کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی کی حیثیت سے تجدید ہورہی ہے، بہار اور مرکزی وزراء اور دانشوروں نے ملک کی مسلم تاریخ اور آج کے مسلمانوں کے خلاف یہ افواہ پھیلانا شروع کر دیا ہے کہ اس قدیم یونیورسٹی کو بختیار خلجی نے خدانخواستہ تباہ و برباد کیا تھا اور یہ سلسلہ لگاتار جاری ہے۔ وزیر اعلیٰ بہار مانجھی، وزیر خارجہ سشما سوراج کے علاوہ بنگالی دانشور نوبل انعام یافتہ امریتہ سین بھی اس افواہ کو مسلسل پھیلا رہے ہیں۔ جس کا جلد کافی وشافی تحقیقی جواب شائع ہونا چاہیے جس کے لیے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی سے بڑھ کے کوئی دوسرا فرد یا ادارہ حق ادا نہیں کرسکتا۔ اگر دارالمصنّفین میں اس کی گنجائش ہو کہ متعلقہ مواد کو کوئی صاحب نشان زد کر کے بالمعاوضہ قیمتاً مع ڈاک خرچ اس کی فوٹو کاپی خاکسار کو ارسال فرماسکیں تو اپنی عمر اور صحت کی بعض معذوریوں کے باوجود اس کار خیر میں اپنی شرکت کو سعادت سمجھوں گا۔

زیادہ بہتر تو یہ ہوتا کہ دارالمصنّفین کا کوئی اسکالر اسے ایک چھوٹا سا تحقیقی پروجیکٹ بنا کر کام جلد مکمل کر لیتا۔ میرے محدود علم کی حد تک مندرجہ ذیل ماٰخذ اس سلسلے میں مفید ہوسکتے ہیں۔ اگر دارالمصنّفین کی لائبریری میں ان میں سے کچھ دستیاب ہوں تو قدیم نالندہ یونیورسٹی کے سلسلے کے مواد کو نشان زد کر کے اگر ممکن ہو تو اس کی فوٹو کاپی مجھے بالمعاوضہ قیمتاً ارسال کیا جاسکتا ہے:

1. History of Aryan Rule in India by E. B. Havel.

2. Vicissitude of Aryan Civilization in India by M. M. Kunte.

3. Peep into Ancient History of India by R.G. Bhandarika.

4. Glories of Magadha by J.N. Samarwar.

5. Bihar through the Ages by R.R. Dewaker Former Governor of Bihar.

6. Comprehensive History of Bihar edited by Bindeshwari pd. Sinha. Kashi pd. Jaysawal Institute of Patna, 1974.

7. Gaya District Gazetteer by P.C. Roy Chowdhry, Govt. Press, Gulzar Bagh, Patna.

8. District of Bihar Archeology by B.P. Sinha.

9. The Antiquarian Remains in Bihar by Dr. D.R. Patil Suprtd: Archeological Survey of India Pages 303-4.

۱۰-نالندہ ویشوودیالیہ اسمرتی گرنتھ از پروفیسر اے گھوش۔

۱۱-نالندہ کے پراچین اوشیش از ڈاکٹر کرشن کانت شرما ڈائریکٹر بہار شریف میوزیم، بہار شریف۔

۱۲-غلط کار مصنّفین میں:

۱۔ڈاکٹر آرینتھ کا مجلّہ ''اسماریکا مہااتسو ۲۰۰۰ء''۔

۲۔ڈاکٹر دیپک کمار بروا کی تصنیف ''نالندہ مہاویہارا ے اسکیچ''ص ٦۔

ان تصانیف کے کہاں ملنے کی زیادہ توقع ہے اگر اس کی بھی نشاندہی ہوسکے تو وہاں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔دارالمصنّفین کی لائبریری میں دیگر کتب سے بھی استفادہ کا پورا امکان ہے۔اکیڈمی میں کیا کسی ایسے صاحب علم کی خدمات بھی دستیاب ہیں جو بالمعاوضہ اس طرح کے متعلقہ مواد و متن کی تلاش کر کے اس کی فوٹو کاپی ارسال کرسکیں؟ یا کم از کم یہ بتاسکیں کہ متعلقہ موضوع پر فلاں فلاں کتب دستیاب ہیں۔

خیر اندیش

خاکسار

احمد سجاد

9431359971

باب التقریظ والانتقاد

پروفیسر عبدالستار صدیقی
حیات اور کارنامے

پروفیسر مقصود احمد
ترجمانی: ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی

اگرچہ عربی ہندوستان کے عوام کی زبان کبھی نہیں رہی لیکن مسلمانوں نے قرآن اور حدیث کی زبان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اس زبان میں دلچسپی لی اور اس حد تک کہ ان کو اس میں درجہ کمال بھی حاصل ہوا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ، ادب اور فلسفہ جیسے علوم پر علمائے ہند قابل قدر تصنیفات ہیں جنہیں بشمول عرب پوری علمی دنیا میں اعتبار حاصل ہے۔ ان میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم وسیع الاطراف علوم کے حامل ہونے کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا علم موسوعی تھا اور لسانیات میں تو دور دوران کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کی تصدیق ان کے ان مضامین سے ہوتی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی تحریریں زیادہ تر اردو زبان میں ہیں لیکن فارسی اور عربی زبانوں میں امتیازی حیثیت نے انہیں اپنے زمانے کے اساطین علم کا مرکز توجہ بنا دیا تھا۔ ان کے معاصرین، ان کے علم و فضل کے معترف تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

سر شفاعت احمد خاں، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر امرناتھ جھا، ڈاکٹر تارا چند، مولوی عبدالحق (م: ۱۹۶۱ء)، مولوی وحید الدین سلیم (م: ۱۹۲۸ء)، حافظ محمود شیرانی (م: ۱۹۴۶ء)، سید سلیمان ندوی (م: ۱۹۵۳ء)، ڈاکٹر ذاکر حسین (م: ۱۹۶۹ء)، مسعود الحسن رضوی (م: ۱۹۵۳ء)، محمد نعیم الرحمٰن (الٰہ آباد یونیورسٹی مصنف ''اساس عربی'')، پروفیسر سعید حسن (الٰہ آباد یونیورسٹی)، ڈاکٹر عبدالعلیم

بڑودہ۔
بھیونڈی۔

(م:۱۹۷۶ء)، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی (م: ۱۹۶۵ء)، قاضی عبدالودود (م:۱۹۸۴ء)، پروفیسر رشید احمد صدیقی (م:۱۹۷۷ء)، پروفیسر مختار الدین، علی گڑھ (۱۹۲۴ء-۲۰۱۰ء)، ان کے ممتاز ترین شاگرد پروفیسر سید محمد رفیق الہ آباد (م:۱۹۹۲ء)، امتیاز علی عرشی (م:۱۹۸۱ء)، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر نذیر احمد۔علی گڑھ (م:۲۰۰۸ء)، مالک رام (م:۱۹۹۳ء)، پروفیسر نورالحسن ہاشمی (م:۱۹۹۹ء)، پروفیسر ایس۔اے۔ایچ۔عابدی دہلی (م:۲۰۱۱ء)، پروفیسر سید احتشام حسین، الہ آباد (م:۱۹۷۲ء)، پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر گوپی چند نارنگ (پ:۱۹۳۱ء)، پروفیسر نثار احمد فاروقی (م:۲۰۰۴ء) وغیرہ۔ان میں سے اکثر نے صدیقی صاحب مرحوم سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔

اس فہرست میں معروف محقق رشید حسن خاں (م:۲۰۰۲ء) کو شامل کرنا ضروری ہے جنہوں نے خود اپنے اعتراف کے مطابق مرحوم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔اپنی مشہور تصنیف ''اردو املا'' میں انہوں نے صدیقی صاحب کو ناقابل یقین اور لاثانی علم کا حامل قرار دیتے ہوئے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔انہوں نے مذکورہ کتاب کو انہیں کے نام معنون کیا ہے۔البتہ اپنی اس کوتاہی پر افسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے وہ ملاقات نہیں کر سکے۔

اس مضمون میں مقصود صاحب نے کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے اس عظیم محقق کے مختصر حالات زندگی بیان کرنے کے علاوہ ان کی بعض تحریروں کا احاطہ کرے۔نیز صدیقی صاحب کی D.Phil. کے مقالہ Studien uber die persischen Freud worter in Klassischen Arabisch کا تعارف بھی مقصود جو جرمن زبان میں لکھا گیا تھا اور جس پر ڈگری دینے کے علاوہ یونیورسٹی نے یہ ہمت افزا رپورٹ دی تھی کہ ''مقالہ قابل اشاعت'' ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کی ولادت ۲۶/دسمبر ۱۸۸۵ء مطابق ۲۹/ربیع الاول ۱۳۰۳ھ کو بہ مقام سندیلہ (ضلع ہردوئی۔یوپی) میں ہوئی۔ان کے والد کا نام عبدالغفار (م:۱۹۱۸ء) تھا، جو سابق ریاست حیدرآباد میں بسلسلہ ملازمت برسرکار تھے۔ڈاکٹر صدیقی صاحب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ فرقانیہ (گلبرگہ) سٹی ہائی اسکول (حیدرآباد) اور چادرگھاٹ ہائی اسکول (حیدرآباد) میں ہوئی۔انہوں نے فارسی اور خطاطی اپنے ماموں منشی علیم علی شوخی سے سیکھی۔

حیدرآباد میں میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ آ گئے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

میں داخلہ لے لیا۔ چونکہ اس وقت علی گڑھ کالج کا الحاق الہ آباد یونیورسٹی سے تھا، اس لیے انہوں نے ۱۹۰۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ (عربی) سال اول میں داخلہ لیا لیکن نامعلوم اسباب کی بناء پر تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ کالج کے تئیں ان کا خلوص اس سے ظاہر ہے کہ ۱۹۰۷ء میں تصدق احمد خاں شیروانی صاحب کی سربراہی میں ایک وفد کے ہمراہ فنڈ جمع کرنے کے لیے وہ برما اب میانمار تشریف لے گئے۔ تصدق احمد شیروانی مرحوم لندن میں آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ وفد کے دوسرے دو ارکان اے۔ آر صدیقی اور ایم۔ عبداللہ تھے۔ غالباً آذوقہ حیات کی فراہمی کی خاطر انہوں نے ۱۹۰۸ء میں صوبہ متوسط (اب اس کا اکثر حصہ مدھیہ پردیش کہلاتا ہے) میں ملازمت اختیار کی۔ ایک سال بعد اول اسسٹنٹ ماسٹر کی حیثیت سے ان کا تقرر کامٹی ضلع ناگپور میں ہوا۔ یہاں تقریباً ایک سال کام کیا۔ ۱۹۱۰ء میں پٹوردھن گورنمنٹ ہائی اسکول ناگپور میں اسی حیثیت سے منتقل ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء ان کی زندگی کا اہم سال تھا جب وہ اپنے چچا منشی عبدالودود صاحب کی بڑی صاحبزادی محسنہ خاتون کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور اپنی ملازمت سے مستعفی ہو کر دوبارہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ وہاں مولوی خلیل احمد اور جرمن مستشرق پروفیسر جوزف ہوروٹز (۱۸۷۴ء-۱۹۳۱ء) سے عربی سیکھنے کا موقع حاصل ہوا، ۱۹۱۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے امتیازی نمبروں سے ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ انہیں حکومت ہند کی طرف سے یورپ میں رہ کر تحقیقی کام کرنے کے لیے وظیفہ دیا گیا۔ پروفیسر جوزف ہوروٹز کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں پروفیسر اینولطمان (Enno Littmann) کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اسٹراسبرگ یونیورسٹی جرمنی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اگست ۱۹۱۲ء میں بحری راستے سے ان کی یورپ کو روانگی ہوئی اور ایک مہینے میں وہ لندن پہنچ گئے۔ وہاں سے جرمنی کے لیے رخت سفر باندھا اور اکتوبر ۱۹۱۲ء میں مذکورہ یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کر لیا۔ یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ ہندوستان سے روانگی کے فوراً بعد ان کی بچی حامدہ کی ولادت ہوئی۔ اس یونیورسٹی کا ماحول حصول تعلیم کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ اس لیے انہوں نے خود کو عربی، فارسی اور دیگر اہم زبانوں کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۳-۱۹۱۲ء میں پروفیسر اینولطمان سے عربی کے

علاوہ سریانی زبان کی بھی تحصیل کی۔ فارسی کی تحصیل تھیوڈور نولدیکی (م ۱۹۲۳ء) سے کرنے کے بعد قدیم فارسی کی تعلیم پروفیسر تھمب سے حاصل کی۔ ۱۹۱۴ء میں جب پروفیسر لطمان نے شعبہ السنہ سامیہ کے صدر کی حیثیت سے پروفیسر جولیس ولہاسن کی جگہ لی تو انہوں نے گوٹنجن یونیورسٹی (Gottingen University) میں ان کی رہنمائی میں عربی، سریانی اور ترکی زبانوں کی تحصیل کی۔ اس کے علاوہ پروفیسر رالف سے عبرانی اور سریانی، پروفیسر ایف۔ سی۔ اندریاس سے اوستا، پہلوی، جدید فارسی اور انگریزی صوتیات مورس باخ سے، سنسکرت گرامر پروفیسر اولڈن برگ سے اور فنون لطیفہ کی تاریخ ڈاکٹر ہوجن سے حاصل کی۔ انہوں نے ۱۹۱۶ء میں لاطینی زبان کا امتحان پاس کیا، یونانی اور جرمن زبانوں کی تحصیل کی اور تقابلی لسانیات کا درس بھی لیا۔ ان کے ایک مقالے میں مشہور فرانسیسی مستشرق گارسن دی تاسی کے حوالے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے فرانسیسی زبان کی بھی تحصیل کی تھی۔

پروفیسر لطمان کی رہنمائی میں ۱۹۱۷ء میں ڈی۔ فل کی ڈگری کے لیے جو مقالہ پیش کیا اسے تحسین کی نظر سے دیکھا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں گوٹنجن یونیورسٹی سے ڈی۔ فل کی اعلیٰ ڈگری لے کر براہ انگلینڈ ہندوستان واپس آئے۔

۱۹۲۰ء میں کچھ مستشرقین کے ساتھ مل کر ''**معجم المفهرس لالفاظ الحديث النبوی**'' کی تیاری میں جو آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، حصہ لیا۔ ہندوستان میں اسے مکتبہ تھانوی، دیوبند سے چھ ہزار روپے کے عوض حاصل کیا جا سکتا ہے۔

علی گڑھ میں بطور لکچرر غالباً فروری ۱۹۲۰ء سے ۱۲ر ستمبر ۱۹۲۰ء تک کام کیا اس کے بعد عثمانیہ کالج حیدر آباد میں بطور پرنسپل منتقل ہو گئے، جہاں انہوں نے اسی حیثیت سے ۱۹۲۴ء تک کام کیا۔ اسی سال بحیثیت صدر شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا۔ اس اہم ذمہ داری کو ۱۹۲۸ء تک نہایت خیر و خوبی سے سنبھالا۔ اسی قلیل مدت میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء کے درمیان ''انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' (شائع شدہ لیڈن) کے لیے کچھ مقالے لکھے۔ ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ الہ آباد کی صدارت کی۔ ۱۹۲۷ء میں السنہ کے مختلف پہلوؤں کے اہم موضوع پر بمبئی یونیورسٹی میں 'ولسن لسانیاتی لکچر' دیے جن کی ماہرین لسانیات میں کافی پذیرائی ہوئی۔

۱۹۲۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں جو اس وقت Oxford of the East کے نام سے

جانی جاتی تھی صدر شعبہ عربی و فارسی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا جہاں اٹھارہ سال تک دونوں زبانوں کی تدریس کی۔اسی دوران آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اردو سکشن کی جو ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا، صدارت کی۔ الہ آباد یونیورسٹی میں ایک طویل عرصہ کامیاب خدمت گزاری کے بعد ۱۹۴۶ء میں انہوں نے سبکدوشی حاصل کی۔فضیلت کے اعتراف میں یونیورسٹی نے پہلا Professor Emeritus ہونے کا اعزاز بخشا۔سبکدوشی کے بعد بھی وہ علمی خدمات انجام دیتے رہے۔راجہ پور میں ان کا مکان صاف ستھرے ماحول میں ایک مخزن العلوم،خوش ذوق، خوش اطوار، پرکشش اور فیاض میزبان اہل علم وادب کی کشش کا مرکز تھا۔ان کی ہزاروں قیمتی کتابوں سے معمور لائبریری بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی۔ وہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے ایک رکن بھی تھے۔۱۹۲۷ء میں الہ آباد میں ''ہندوستانی اکیڈمی'' کی تاسیس میں بھی حصہ لیا۔ یہ اکیڈمی بعد میں ہر مکتب فکر اور عقیدہ و مذہب کے صاحبان علم کی توجہ اور ان کی باہم ملاقات کا ایک مرکز بنی۔اس کے سہ ماہی جریدہ ''ہندوستانی'' کے معیار کی بلندی اور توسیع اشاعت میں انہوں نے ایک سرپرست کا کردار ادا کیا۔ یہ رسالہ الہ آباد سے اصغر گونڈوی مرحوم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔انہوں نے Linguistic Society of India کی تاسیس میں بھی بنیادی کردار ادا کیا تھا اور تاحیات تاسیسی رکن کی حیثیت سے اس کے مقاصد کی توسیع اور اس کے ارکان میں اضافہ کے لیے کوشاں رہے۔

عربی زبان میں ان کی قابل قدر خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۱ء میں انہیں Certificate of Honour (جسے عرف عام میں صدارتی ایوارڈ سمجھا جاتا ہے) کے پرشکوہ اعزاز سے نوازا گیا اور ۲۸/اپریل ۱۹۶۲ء کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد کے ہاتھوں راشٹر پتی بھون میں ایک سرٹیفکٹ ، ایک شال اور تاعمر وظیفہ سے ان کی قدر افزائی کی گئی۔ دنیائے علم و تحقیق میں ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پبلی کیشنز ڈویژن، گورنمنٹ آف انڈیا (نظر ثانی شدہ ایڈیشن، اپریل ۱۹۶۶ء) میں اہم اور چیدہ علماء کی فہرست میں ان کا نام شامل ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر اس دعوت نامہ کا ذکر کر دیا جائے جس میں بمبئی یونیورسٹی نے 'ماہرین عبرانی لسانیات' کے موضوع پر لکچر دینے کے لیے دوسری بار ان کو مدعو کیا تھا لیکن کبرسنی اور ضعف کی وجہ سے انہوں

نے اس دعوت کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کردی تھی۔ایک روشن ستارے کے مانند اپنے علم کی روشنی بکھیرتے ہوئے ۲۸؍ جولائی ۱۹۷۲ء مطابق ۱۶؍ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۲ھ کو علم و تحقیق کا یہ تابناک ستارہ اپنی رہائش گاہ میں غروب ہوکر رب کائنات کے سامنے حاضر ہوگیا۔ تدفین دوسرے دن راجہ پور قبرستان میں ہوئی۔انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ۔

ان کے دو بیٹے ہیں، محمد مسلم صدیقی اور محمد زبیر صدیقی ۔ بڑے صاحبزادے محمد مسلم نے شادی نہیں کی اور پوری زندگی تجرد کی حالت میں گزار کر ۲۶؍ اگست ۱۹۹۶ء کو الہ آباد کے پریتی نرسنگ ہوم میں آخری سانس لی۔دوسرے صاحبزادے تقسیم ملک کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور کراچی میں اقامت اختیار کر لی۔ بدقسمتی سے ۸؍ جون ۱۹۷۹ء کو سڑک کے ایک حادثے میں واصل بحق ہوگئے۔ اللھم اغفر لھما ۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کی تصنیفات: ڈاکٹر صدیقی صاحب نے اپنی قلمی زندگی کا آغاز ۱۸۹۹ء کی ابتدا میں کیا جب کہ انہوں نے ''انتخاب ادب'' کے عنوان سے اردو نثریات کا ایک انتخاب مرتب کیا جو ۲۶؍ اپریل ۱۸۹۹ء کو ''انتخاب لا جواب'' (لاہور) میں شائع ہوا۔اس کے بعد ان کا مقالہ ''صحیح اور غلط اردو'' علی گڑھ کے رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' کے اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے کی زینت بنا۔

اردو میں کچھ مقالات رقم کرنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں جرمن زبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ پانچ سال بعد عام رسائی کی خاطر انہوں نے انگریزی کا رخ کیا۔۱۹۲۳ء میں ان کے قلم نے اردو کی طرف رجوع کیا۔اس کا سبب غالباً یہ رہا ہوگا کہ نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں نے مادری زبان میں تعلیم و تعلم اور ملکی زبانوں کو عام کرنے کی تحریک شروع کی تھی۔اس طرح ۱۹۲۳ء سے ۱۹۶۱ء تک انہوں نے عربی، فارسی اور اردو کے تحقیقی مسائل پر کثرت سے مضامین لکھے۔اس دوران انگریزی زبان ان کے رشحات قلم سے محروم نہیں رہی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے فارسی معلیٰ میں ''معربات رشیدی'' مرتب فرمائی جو ۱۹۵۵ء میں پروفیسر مختارالدین آرزو صاحب کی نگرانی میں طبع ہوئی لیکن بوجوہ شائع نہ ہوسکی۔

یہ بات تعجب خیز ہے کہ عربی زبان میں مہارت کے باوجود ان کا کوئی کام اس عظیم زبان

میں سامنے نہیں آیا۔اس کا ظاہری سبب یہی ہوسکتا ہے کہ ان کی علمی فتوحات کے زمانے تک عربی زبان کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں تھا اور اس زبان میں کوئی رسالہ بھی ہندوستان میں شائع نہیں ہوتا تھا۔

ذیل میں اردو، جرمن، انگریزی اور فارسی زبانوں میں زمانی ترتیب کے مطابق ان کے ادبی، تاریخی، لسانیاتی، تنقیدی اور علمی کارناموں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مقالات بزبان اردو: (۱) انتخاب اردو (چند ادبی نثر پارے) شائع شدہ ہفت روزہ ''انتخاب لا جواب'' لاہور۔ ۲۶/اپریل ۱۸۹۹ء۔ (۲) اردو میں صحیح اور غلط۔ شائع شدہ'' اردوئے معلیٰ'' علی گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء۔ (۳) ہم نیکی کیوں کریں؟ علی گڑھ ''منتھلی''۔ جلد ۵، مئی ۱۹۰۷ء۔ (۴) انتخاب کلام انشاء۔''لسان العصر''۔لکھنؤ۔مئی۔ جون ۱۹۱۰ء۔ (۵) انتخاب دیوان میر حسن۔''لسان العصر''۔لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۱۰ء۔ (۶) غالب کا ایک تاریخی قطعہ (جو دیوان میں نہیں ہے)۔''لسان العصر'' لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۱۰ء۔ (۷) اردو صرف ونحو کی ضرورت۔ ''لسان العصر'' لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۱۰ء۔ (یہ مقالہ ''مقالات صدیقی اول'' میں شامل ہے)۔ (۸) احوال اسلام۔''اردو'' اورنگ آباد (دکن)۔ اپریل ۱۹۲۳ء۔ (یہ مقالہ ''مقالات صدیقی اول'' میں شامل ہے)۔ (۹) تبصرہ آرائش زن ناقص مصنفہ Doself Recken۔''اردو'' اورنگ آباد (دکن) اپریل ۱۹۲۳ء۔ (۱۰) تبصرہ دیوان غالب (برلن)۔''اردو'' اورنگ آباد (دکن)۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء۔ (۱۱) تبصرہ ایک فارسی زبان کا رسالہ۔ (ایران۔شہر۔ برلن) ''اردو'' اورنگ آباد (دکن)۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء۔ (۱۲) اردو رسم الخط میں اصلاح۔''اردو'' اورنگ آباد (دکن)۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء۔ (۱۳) اصلاح سخن پر تبصرہ ۱۹۳۶ء۔ مشمولہ کتاب ''اصلاح سخن'' مصنفہ عبدالعلی شوق سندیلوی۔ یہ مقالہ ''مقالات صدیقی اول'' میں شامل ہے۔ (۱۴) مذکورہ ''اصلاح سخن'' میں شامل ایک ادبی مکتوب مؤرخہ ۲۸ مئی ۱۹۲۶ء۔ (یہ مقالہ ''مقالات صدیقی اول'' میں بطور ضمیمہ ص ۳۳۵-۳۳۹ زیر عنوان لفظ ''محشر'' شامل ہے)۔ (۱۵) فارسی ادب کی تاریخ کی جرمن تالیف کے مقدمے کا ترجمہ جو'اورینٹل کالج میگزین'' لاہور، فروری ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا۔ (۱۶) خطبہ صدارت مسلم ٹیچرس کانفرنس۔ الہ آباد ۱۹۲۹ء۔ مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، ۱۹۳۰ء۔ (۱۷) (سلیمان اشرف کی کتاب) ''المبین'' پر تبصرہ۔''معارف'' (اعظم گڑھ) مارچ ۱۹۳۰ء۔ (۱۸) اردو املا۔

سہ ماہی ''ہندوستانی'' (الہ آباد) کے پہلے شمارے میں شائع ہوا۔ (یہ مقالہ ''مقالات صدیقی اول'' میں شامل ہے)۔ (۱۹) تصحیح (لفظ ''رواں'' کی تحقیق)۔ ''ادبی دنیا'' لاہور، نومبر ۱۹۳۱ء۔ (۲۰) تعلیم جدید اور مسلمان۔ ''ادبی دنیا'' (لاہور)، نومبر ۱۹۳۱ء۔ (۲۱) ''ہندستان'' بغیر واؤ کے صحیح ہے۔ سہ ماہی ''ہندوستانی'' (الہ آباد)۔ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۲۱ (یہ مقالہ ''مقالات صدیقی اول'' میں شامل ہے)۔ (۲۲) ''تماہی'' کی ترکیب۔ ''ہندوستانی'' (الہ آباد)۔ جنوری ۱۹۳۲ء۔ (یہ مقالہ ''مقالات صدیقی اول'' میں شامل ہے)۔ (۲۳) ایک ادبی مکتوب مورخہ ۶/اپریل ۱۹۳۲ء (مشمولہ ''مقالات صدیقی اول'' زیر عنوان ''ضمیمہ'' ص ۷۲-۷۳)۔ (۲۴) دیباچہ ''ہندوستانی لسانیات'' از سید محی الدین قادری زور (پہلا ایڈیشن) ۱۹۳۲)۔ (۲۵) ''افسوس'' (لفظ کا ایک بھولا ہوا مفہوم)۔ ''ادبی دنیا'' (لاہور)۔ نوروز نمبر ۱۹۳۲ء، (مشمولہ ''مقالات صدیقی اول'')۔ (۲۶) کچھ بکھرے ہوئے ورق (کچھ خطوط اور متفرق اشعار مرزا غالب کی بعض تحریریں)۔ ''ہندوستانی'' (الہ آباد)۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء۔ (۲۷) کچھ اور بکھرے ورق (مرزا غالب سے متعلق)۔ ''ہندوستانی'' (الہ آباد) جنوری ۱۹۳۴ء۔ (۲۸) غالب کے خطوں کے لفافے۔ ''ہندوستانی'' (الہ آباد)۔ اپریل ۱۹۳۴ء۔ (۲۹) حافظ کے کلام میں کلام۔ ''سہیل'' (علی گڑھ)۔ جنوری ۱۹۳۶ء۔ (مشمولہ ''مقالات صدیقی اول'' زیر عنوان ''معائب سخن کلام حافظ کی روشنی میں''۔ (۳۰) ''جز'' اور ''جزو'' کی بحث۔ ''معیار'' (بانکی پور۔ پٹنہ)۔ جولائی۔ اگست ۱۹۳۶ء (یہ مقالہ ''مقالات صدیقی اول'' میں شامل ہے)۔ (۳۱) ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں ''کو'' کا استعمال۔ ''معیار'' جولائی۔ اگست ۱۹۳۶ء۔ (۳۲) تبصرہ۔ ''مکاتیب غالب'' از امتیاز علی خاں عرشی۔ سہ ماہی ''ہندوستانی'' (الہ آباد)۔ جولائی ۱۹۳۸ء۔ (۳۳) بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق (استدراک)۔ ماہانہ ''معارف'' (اعظم گڑھ)۔ ستمبر ۱۹۳۹ء۔ (یہ مقالہ ''مقالات صدیقی اول'' میں شامل ہے)۔ (۳۴) سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک مکتوب جو ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا اور ستمبر ۱۹۳۹ء کے ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں شائع ہوا۔ (مشمولہ ''مقالات صدیقی اول'' ص ۱۰۴-۱۰۵ از یر عنوان ''تمہید اور بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق پر تبصرہ'')۔ (۳۵) سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط مورخہ ۱۹۳۹ء مطبوعہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) ستمبر ۱۹۳۹ء۔ (یہ خط بھی ''مقالات صدیقی اول'' میں ص ۱۰۵-۱۰۶ پر مندرجہ بالا عنوان کے

تحت موجود ہے)۔(۳۶) بغداد کی وجہ تسمیہ۔شائع شدہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) اکتوبر ۱۹۳۹ء۔
یہ مقالہ دوبارہ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے ''اردو'' میں شائع ہوا ہے (مشمولہ ''مقالات صدیقی اول'')۔
(۳۷) گارسن دی تاسی کے تمہیدی خطبے (بہ تصحیح عبدالستار صدیقی)۔انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
۱۹۴۰ء۔(۳۸) مقدمہ خطوط غالب از مہیش پرشاد۔شائع کردہ ''ہندوستانی اکیڈمی'' الہ آباد ۱۹۴۱ء۔
(۳۹) خطبہ صدارت۔اردو سکشن۔آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، حیدرآباد (دکن) دسمبر ۱۹۴۱ء۔ یہ
خطبہ انڈین پریس الہ آباد میں طبع ہوا۔(۴۰) روداد کمیٹی اصلاح رسم خط۔''ہماری زبان'' ۱۶/ستمبر
۱۹۴۳ء۔(۴۱) ہندوستان کے پرانے اخبار۔''ہندوستانی'' (الہ آباد) اکتوبر ۱۹۴۴ء تا اکتوبر
۱۹۴۵ء۔(۴۲) تنقید باغ نشاط۔پنڈت رادھے ناتھ گلشن الہ آبادی کی نظموں کا مجموعہ۔طبع انڈین
پریس الہ آباد، ۱۹۴۵ء۔(۴۳) ولی کی زبان۔''اردو'' (دہلی) جولائی ۱۹۴۵ء۔مشمولہ ''کلیات ولی''
مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔طبع ثانی۔شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۶ء۔(مشمولہ ''مقالات
صدیقی اول'')۔(۴۴) کتابت کے لیے کچھ عام ہدایتیں۔ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (دہلی) ۱۶/
اکتوبر ۱۹۴۵ء۔(۴۵) محمود شیرانی۔''ہندوستانی'' (الہ آباد) اپریل ۱۹۴۶ء۔(۴۶) لفظ ''سغد''
کی تحقیق۔''ہندوستانی'' (الہ آباد) اپریل۔جولائی ۱۹۴۶ء (مشمولہ ''مقالات صدیقی اول'')۔
(۴۷) حیات شیخ چلی کا مصنف۔''ہماری زبان'' یکم اپریل ۱۹۴۶ء نیز ''ہندوستانی'' اپریل ۱۹۴۶ء
(۴۸) مکتوب گرامی (زبان وقواعد کے سلسلے میں)۔ماہنامہ ''آجکل'' (دہلی) ۱۵/مارچ ۱۹۴۷ء۔
(۴۹) کچھ غیر لفظ۔اردو میں۔''آجکل'' (دہلی) جون ۱۹۴۷ء۔(۵۰) دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب
''علی گڑھ میگزین'' ۱۹۴۸ء/۱۹۴۹ء۔مرتبہ پروفیسر مختارالدین احمد (علی گڑھ) دہلی ۱۹۴۶ء۔
(۵۱) شاہجہاں کی ایک مثبت کار تصویر۔''آجکل'' (دہلی) ستمبر ۱۹۵۰ء۔(۵۲) اردو میں ضمائر
مفعولی کی کچھ تحقیق۔''قومی زبان'' (کراچی) جنوری ۱۹۵۱ء۔(مشمولہ ''مقالات صدیقی اول'')۔
(۵۳) ڈاکٹر اسپرنگر۔شائع شدہ دہلی کالج اردو میگزین (قدیم دلی کالج نمبر)۔دہلی ۱۹۵۳ء۔
(۵۴) ذال معجمہ فارسی میں۔''ارمغان علمی'' نذر شفیع (لاہور) ۱۹۵۵ء۔(مشمولہ ''مقالات
صدیقی اول'')۔(۵۵) Enno Littmann (۱۶/ستمبر ۱۸۷۵ء-۴/مئی ۱۹۵۸ء)۔''مجلّہ علوم
اسلامیہ'' (علی گڑھ) جون ۱۹۶۰ء۔ یہ مقالہ پروفیسر مختارالدین احمد کی درخواست پر یکم جولائی

۱۹۶۰ء کو لکھا گیا اور مذکورہ مجلّہ میں غالباً جولائی یا اگست ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔(۵۶) وضع اصطلاحات پر تبصرہ۔ ''نوائے ادب'' (بمبئی) ۱۹۶۱ء۔ (یہ مقالہ بھی ''مقالات صدیقی اول'' میں شامل ہے)۔(۵۷) معرب لفظوں میں حرف ''ق'' کی حیثیت۔ ''مجلّہ علوم اسلامیہ'' (علی گڑھ) جون ۱۹۶۱ء۔ (مشمولہ ''مقالات صدیقی اول'')۔(۵۸) استدراک (سفرنامہ ابن بطوطہ کے سلسلے میں) ''معارف'' (اعظم گڑھ) جنوری ۱۹۶۲ء۔(۵۹) کتابوں کا محل (رامپور رضا لائبریری) ''آجکل'' (دہلی) ستمبر ۱۹۶۷ء۔(۶۰) دیباچہ ''نظریہ سلطنت'' از Belancheli۔ یونانی کتاب کے انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ۔ مترجم قاضی تلمذ حسین (نایاب)۔(۶۱) دیباچہ ''وقائع عالم گیر'' از چودھری نبی احمد سندیلوی۔ طبع ثانی۔ علی گڑھ (نایاب)۔(۶۲) خطبہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس (نایاب)۔ (نوٹ: مذکورہ تفصیلات ''ہماری زبان'' جلد ۵۳ نمبر ۳۰ (۸/اگست ۱۹۹۴ء) ص ۱، ۶، اور "The Collegian" (اردو سکشن) (لکھنؤ) ۹۹-۱۹۹۸ء ص ۱۱ تا ۱۳ سے حاصل کی گئی ہیں۔(۶۳) ''نوادر المکاتیب'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام مکتوب الیہ کے شائع کردہ خطوط جو ''اردو نامہ'' نمبر ۴۴۔۴۵ کراچی کے مارچ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئے۔ (۶۴) پروفیسر مختار الدین صاحب کے نام ۱۰/مارچ ۱۹۴۴ء تا ۱۴/اپریل ۱۹۵۸ء کے دوران لکھے گئے ۴۶ خطوط، جو جامعہ سندھ جام شورو کے رسالہ ''تحقیق'' نمبر ۱۲۔۱۳، ۹۹-۱۹۹۸ء میں شائع ہوئے۔(۶۵) دیوان البیان (نامکمل/نایاب)۔ ڈاکٹر صدیقی خواجہ احسن اللہ خاں بیان دہلوی شاگرد مرزا مظہر جان جاناں کی نظموں بالخصوص غزلوں کے شائق تھے۔ اس لیے وہ ان کے کلام کا ایک معتبر مصدقہ نسخہ سالار جنگ میوزیم، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود مخطوطات کی مدد سے تیار کرنا چاہ رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ناتمام رہ گیا۔ (دیکھئے Collegian اردو سکشن صفحہ ۱۶)۔(۶۶) انشائے غالب (نامکمل) حیدر آباد کے دوران قیام صدیقی صاحب نے اس کا مخطوطہ ایک نامعلوم شخص سے حیدر آباد میں خریدا تھا انہوں نے اسے محنت سے مرتب کیا اور اپنے بیش قیمت حواشی کا اضافہ کر کے اس کی کتابت بھی کرائی لیکن اس پر مقدمہ لکھنے کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ آخر وقت میں جب ان کا حافظہ جواب دے گیا تھا، ان کے صاحبزادے جناب مسلم صدیقی صاحب نے اسے جناب مالک رام کے حوالے کیا تھا اور

اصرار کیا تھا کہ وہ اس پر مقدمہ لکھ دیں تا کہ اس کی جلد از جلد رونمائی ہوسکے۔ جناب مالک رام نے فوری طور سے اس خواہش کی تکمیل کردی تھی اور اس پر تشریحات کا اضافہ کرکے اکتوبر ۱۹۷۲ء اور دسمبر ۱۹۷۲ء میں مسلم صاحب کو روانہ کردیا۔ اس کے باوجود مسودہ پریس کو نہ جا سکا۔ جب رشید حسن خاں صاحب کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے مسلم صاحب سے اسے ممکنہ عجلت کے ساتھ شائع کرنے کے لیے زور دیا۔ مسلم صاحب نے یہ مسودہ خاں صاحب ہی کے حوالے کردیا تا کہ وہ دہلی میں اسے شائع کرنے کی کوشش کریں۔ خاں صاحب نے بغور مطالعہ کرکے اس پر ایک مفصل تعارف نامہ کا اضافہ کرکے جون ۱۹۹۴ء میں پورا مواد جس میں اصل مخطوطہ، صدیقی صاحب کی تعلیقات، مالک رام صاحب کا مقدمہ اور رشید حسن خاں صاحب کا تعارفی مضمون شامل تھے برائے اشاعت اس وقت کے مکتبہ جامعہ کے منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کے حوالے کردیے جنھوں نے اسے اکتوبر ۱۹۹۴ء میں شائع کردیا۔ ایک بات کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا کہ اصل مخطوطہ کا کوئی نام نہیں تھا۔ اسے ''انشائے غالب'' کا نام غالباً صدیقی صاحب ہی نے دیا تھا۔ (دیکھئے ''انشائے غالب'' پر رشید حسن خاں صاحب کا تعارف)۔ (۶۷) ''مقالات صدیقی اول''، مرتبہ مسلم صدیقی، شائع کردہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء۔ اس میں دوسرے مضامین کے علاوہ صدیقی صاحب کے اٹھارہ شائع شدہ مقالات ہیں۔ اس کا سہرا بھی رشید حسن خاں صاحب کے سر ہے کیونکہ انہیں کے اصرار پر یہ کتاب شائع ہوسکی ہے۔ (۶۸) ''مقالات صدیقی دوم'' (غیر مطبوعہ)۔ مرتبہ مسلم صدیقی۔ اس کا مسودہ بھی جناب رشید حسن خاں صاحب کی معرفت جناب شاہد علی خاں صاحب کے حوالے کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے ابھی تک اس کا دیدار نہیں ہوسکا۔ اس جلد میں کچھ مطبوعہ مضامین جیسے ڈاکٹر اینولطمان، سلیمان اشرف صاحب کی کتاب ''المبین'' پر تعقیب وتبصرہ، محمود شیرانی، تبصرہ مکاتیب غالب، دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب، غالب کے خطوط کے لفافے، کچھ بکھرے ہوئے ورق (کچھ خطوط اور متفرق اشعار مرزا غالب کی بعض تحریریں)، کچھ اور بکھرے بکھرے ورق (مرزا غالب سے متعلق)، ہندستان کے پرانے اخبار، فارسی ادب کی تاریخ، شاہجہاں کی منبت کار تصویر وغیرہ شامل ہیں۔ (یہ معلومات ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (دہلی) جلد ۵۳ شمارہ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۸/ اگست ۱۹۹۴ء سے حاصل کی گئی ہیں)۔

مقالات بزبان جرمن: (۱) studien uber die Persischen Fremdworter im Klassischen Arabisch (Studies in the Persian Loan Words in Classical Arabic) (کلاسیکی عربی میں فارسی سے مستعار الفاظ کا مطالعہ)۔ یہ مقالہ ۱۹۱۹ء میں گوٹنجن (جرمنی) میں طبع ہوا۔اسی مقالہ پر صدیقی صاحب کو .D.Phil کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ (۲) ''ہاروت ماروت'' کے عنوان پر جرمن زبان میں لکھا گیا ایک مضمون جو اب نایاب ہے۔

مقالات بزبان انگریزی: (۱) علی ابن ربن طبری کی کتاب ''الدین والدولۃ'' کے انگریزی ترجمہ از اے۔منگنا ڈی۔ڈی۔(مانچسٹر ۱۹۲۲ء) پر تبصرہ جو ڈھاکہ کے Peace نامی مجلّہ۔شمارہ ستمبر ۱۹۲۵ء کے ص ۱۴۰-۱۴۲ پر شائع ہوا۔

(۲) مانی۔ایران قدیم کا ایک مصلح،شائع شدہ ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل'' (فروری ۱۹۲۶ء) ص ۱۰۷-۱۱۶۔ (۳) حرف ''ق'' اور فارسی سے مستعار عربی زبان میں اس کی اہمیت۔ایک مقالہ جو ۱۹۲۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں منعقدہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں پیش کیا گیا۔اس کا پورا متن روداد کے مجموعہ (جلد اول) ص ۲۲۳-۲۳۲ پر موجود ہے۔یہ جرنل ۱۹۲۷ء میں انڈین پریس الہ آباد میں طبع ہوا ہے۔(۴) کیا Guava ''امرود'' کا اصل نام ہے؟ ایک نوٹ جو جرنل آف دی رایل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے ص ۵۵۹-۵۶۱ پر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ (۵) گھڑیال کی صنعت اور اسلامی تہذیب۔شائع شدہ سہ ماہی ''اسلامک کلچر'' حیدرآباد (دکن) جلد اول کے شمارہ نومبر۔جنوری ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ (۶) ولسن لسانیاتی لکچرس (پانچ تقاریر جو بمبئی یونیورسٹی کی دعوت پر جنوری ۱۹۲۷ء میں آپ نے کیں)۔ (۷) ''ابن دُرید اور اس کا استقراض الفاظ''۔ جو پہلے ''الہ آباد یونیورسٹی اسٹڈیز'' جلد ششم (الہ آباد ۱۹۳۰ء) ص ۶۶۹-۷۵۰ پر شائع ہوا۔بعد میں اسے کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔(عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔دکن) میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ (۸) ''معلم عربی'' (حصہ اول)۔شائع شدہ سہ ماہی Teaching (ایک ٹیکنکل جرنل برائے اساتذہ جلد چہارم) نمبر ۲ دسمبر ۱۹۳۱ء ص ۵۴-۵۹۔ (۹) ''معلم عربی'' (حصہ دوم) شائع شدہ سہ ماہی Teaching جلد چہارم نمبر ۱۴ جون ۱۹۳۲ء۔

(۱۰) ''معلم فارسی'' شائع شدہ سہ ماہی Teaching (جلد چہارم)، شمارہ نمبر ۴، جون ۱۹۳۲ء۔ (۱۱) ''ہمایوں نامہ'' میں ہندوستانی الفاظ مشمولہ ''پونا اورینٹل سیریز'' نمبر ۲۹، جھا کمومیریشن والیوم، ایسیز آن اورینٹل سبجکٹس (Jha Commemoration Volume, Essays on Oriental Subjects)، جو پنڈت گنگا ناتھ جھا (جو اس وقت الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے) کی خدمت میں ۲۵ر ستمبر ۱۹۳۲ء کو ان کی ساٹھ سالہ حیات کے مکمل ہونے پر پیش کی گئی (پونا اورینٹل بک ایجنسی ۱۹۳۷ء۔ ص ۳۶۷-۲۷۶)۔ (۱۲) سید منظور علی کی مرتبہ ''تذکرہ بے نظیر'' مصنفہ سید عبدالوہاب افتخار، مشمولہ الہ آباد یونیورسٹی پبلی کیشنز، عربی و فارسی سکشن، جلد اول (سینیٹ ہاؤس الہ آباد ۱۹۴۰ء۔ ص ۷-۱۳) کا تعارف۔

(۱۳) جرمن زبان میں Bertold Spulers Handbuch der Orientalislik -1 (Leiden, 1953) پر تبصرہ۔ (یہ تبصرہ جرمن زبان میں ہے)۔

(۱۴) A Review of Sefer Hay - Yobel L'Kabod Professor Elyaqim G. Weil (GottholdWell commemoration Volume) on the occasion of his seventieth birthday , May13, 1952. The Magnes Press, The Hebrew University , Jerusalem,1952. یہ نسخہ اصلاً عبرانی زبان میں ہے۔

یہ تبصرہ سہ ماہی "Islamic Culture" حیدرآباد کے شمارہ Vol. XXXI, No. 3, July, 1957, میں ص ۲۶۸ پر شائع ہوا ہے۔

(۱۵) مرقع شاہجہانی (غیر شائع شدہ)۔ (۱۶) لسانیات اور تعلیمیات کے موضوع پر کچھ مزید تحریریں جو شائع نہیں ہوسکیں۔ (۱۷) ''معربات رشیدی'' کا مقدمہ، جس میں عبدالرشید کے حالات زندگی ''منتخب اللغات''، ''فرہنگ رشیدی'' نیز معربات رشیدی'' کے دو مخطوطات کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ نامکمل ''مقدمہ'' غالباً ۱۹۵۵-۵۶ء کے درمیان لکھا گیا تھا۔

فارسی میں صدیقی صاحب کی مرتبہ کتابیں: ''معربات رشیدی'' مذکورہ نمبر ۱۷ کی تفصیل کے بموجب ڈاکٹر مختارالدین صاحب نے طبع کرائی لیکن بوجوہ اس کا اجراء نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب نے اس کے طبع ثانی کو دوبارہ مرتب کر کے انگریزی زبان میں مزید حاشیوں کا

اضافہ کیا۔اس پوری کاوش کا جس میں مصنف کا فارسی متن بھی شامل ہے، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اردو میں ترجمہ کیا جو ۲۰۰۳ء میں کراچی میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر صدیقی صاحب کی D.Phil. کی Thesis: درج بالا ذخیرہ تحریر کے علاوہ ان کا ڈی۔فل۔کی ڈگری کے لیے تحریر کردہ مقالہ انتہائی قدر و قیمت کا حامل ہے کیونکہ اس پر معروف مستشرقین جیسے آر۔اے۔نکلسن (م:۱۹۴۵ء)، جی۔کے۔نریمان، اڈولف اے۔بی۔تھیوڈور نولدیکی، جی۔برگسٹر الگر اور اے۔گستاوس کی نظر ثانی ہونے کے علاوہ اس کے بہت سے حوالے آرتھر جیفری نے اپنی مایۂ ناز تصنیف The Foreign Vocabulary of the Quur'an (قرآن کے غیر عربی الفاظ) میں دیے ہیں۔یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں بڑودہ میں شائع ہوئی ہے۔

زیر تذکرہ مقالہ جیسا کہ پیشتر تحریر کیا جا چکا ہے ۱۹۱۹ء میں گوٹنجن (جرمنی) میں جرمن زبان میں عربی زبان میں فارسی کے معرب الفاظ کے عنوان سے لکھا گیا تھا۔اس مقالہ کا ایک نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (انڈیا) میں محفوظ ہے۔یہ نسخہ مصنف نے خود صلاح الدین خدا بخش کو جولائی ۱۹۲۶ء میں ہدیہ کیا تھا۔اس بیش قیمت مقالے کو جو ۸+۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے پروفیسر ڈاکٹر ٹی۔ڈبلیو۔آرنلڈ کے نام معنون کیا گیا ہے۔اس کے عنوانات کی فہرست حسب ذیل ہے۔

پیش لفظ نومبر ۱۹۱۸ء میں گوٹنجن میں تین صفحات میں لکھا گیا تھا۔ چوتھا صفحہ خالی ہے۔

عربی کے تنقیدی مصادر میں صدیقی صاحب نے درج ذیل علماء اور ماہرین لسانیات اور ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ابن عباسؓ (م:٦٨ھ) ۲۔رافعؓ (م:۴۷ھ) ۳۔عطاء بن یسارؒ (م:۹۴ھ) ۴۔ابن جبیرؒ (م: ۹۵ھ) ۵۔مجاہدؒ (م: ۱۰۱ھ) ٦۔عکرمہؒ (م: ۱۰۵ھ) ۷۔عیسی بن عمر الثقفی (م: ۱۴۹ھ) ۸۔ابوعمرو بن العلی (م:۱۵۴ھ) ۹۔سفیان الثوریؒ (م:۱٦۱ھ) ۱۰۔الخلیل (م:۱۷۰ یا ۱۷۵ھ) ۱۱۔اللیث المظفر (م: ۱۸۰ھ) ۱۲۔سیبویہ (م: ۱۷۷ یا ۱۸۰ھ) ۱۳۔ یونس بن حبیب (م:۱۸۳ھ) ۱۴۔الکسائی (م:۱۸۹ھ) ۱۵۔السدوسی (م: ۱۹۵ھ) ۱٦۔نضر بن شمائل (م:۲۰۴ھ) ۱۷۔ابن الکلبی (م:۲۰٦ھ) ۱۸۔ابوعمرو الشیبانی (م:۲۰٦ھ) ۱۹۔الفراء (م: ۲۰۷ھ) ۲۰۔ابوعبیدہ (م: ۱۲۰ھ) ۲۱۔ابو زید الانصاری (م: ۲۱۵ھ) ۲۲۔الاصمعی (م: ۲۱٦ھ) ۲۳۔ ابوعبید (م:۲۲۴ھ) ۲۴۔ابوعمر الجرمی (م: ۲۲۵ھ) ۲۵۔ابن العربی (م: ۱۳۱ھ) ۲٦۔عبداللہ بن محمد بن ہارون توازی (م:۲۳۸ھ) ۲۷۔ابن سکیت (م:۲۴٦ھ) ۲۸۔المازنی (م: ۲۴۹ھ) ۲۹۔نصر بن علی (م: ۲۵۰ھ) ۳۰۔ابو حاتم السجستانی (م: ۲۵۰ھ) ۳۱۔الریاشی (م: ۲۵۷ھ) ۳۲۔ابن قتیبہ (م: ۲۷٦ھ) ۳۳۔ابوحنیفہ الدینوری (م: ۲۸۲ھ) ۳۴۔ابواسحاق الحربی (م: ۲۸۵ھ) ۳۵۔ابوالعباس المبرد (م:۲۸۵ھ) ۳٦۔ابوالعباس احمد بن یحیٰی ثعلب (م: ۲۹۱ھ) ۳۷۔الزجاج (م: ۳۱۰ھ) ۳۸۔ابن السراج (م: ۳۱٦ھ) ۳۹۔المفجع (م:۳۲۰ھ) ۴۰۔ابن درید (م:۳۲۱ھ) ۴۱۔ ابن الانباری (م: ۳۲۸ھ) ۴۲۔

ابن درستویہ (م: ۳۴۷ھ) ۴۳۔ حمزہ الاصفہانی (م: ۳۵۰ یا ۳۶۰ھ) ۴۴۔ ابوسعید السیر افی (م: ۳۶۴ھ) ۴۵۔ ابن خالویہ (م: ۳۷۰ھ) ۴۶۔ ابومنصور الازہری (م: ۳۷۰ھ) ۴۷۔ ابوعلی (م: ۳۷۷ھ) ۴۸۔ الصاحب بن عباد (م: ۳۸۵ھ) ۴۹۔ ابن فارس (م: ۳۹۰ھ) ۵۰۔ عبدالباقی بن محمد (م: ۳۹۰ھ) ۵۱۔ ابوالفتح عثمان بن جنی (م: ۳۹۲ھ) ۵۲۔ الجوہری (م: ۳۹۳ھ) ۵۳۔ ابو ہلال العسکری (م: ۳۹۵ھ) ۵۴۔ الہروی (م: ۴۰۱ھ) ۵۵۔ ابومنصور الثعالبی (م: ۴۲۹ھ) ۵۶۔ ابوالعلاء المعری (م: ۴۴۹ھ) ۵۷۔ ابن سیدہ (م: ۴۵۸ھ) ۵۸۔ البطلیوسی (م: ۵۲۱ھ) ۵۹۔ ابومنصور الجوالیقی (م: ۵۳۹ھ) ۶۰۔ السیوطی (م: ۱۵۰۵ء)۔

فارسی کے تنقیدی مصادر میں درج ذیل لغویوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

۱۔ فرہنگ نامہ (ساتویں صدی ہجری) ۲۔ ادات الفضلاء از خان محمود دہلوی (م: ۸۲۳ھ) ۳۔ فرہنگ جہانگیری از جمال الدین حسین ۴۔ برہان قاطع از محمد حسین برہان (م: ۱۰۶۰ھ) ۵۔ قاطع برہان از غالب (م: ۱۸۶۹ء) ۶۔ موید برہان از آغا احمد علی ڈھاکوی ۷۔ ساطع البرہان از عبدالرحیم میرٹھی ۸۔ تیغ تیز از غالب ۹۔ نامہ غالب از غالب ۱۰۔ شمشیر تیز تر ۱۱۔ فرہنگ ناصری از رضا قلی خان ۱۲۔ فرہنگ رشیدی از سید عبدالرشید (م: ۱۰۶۹ھ) ۱۳۔ چراغ ہدایت از خان آرزو ۱۴۔ ہفت قلزم از غازی الدین لکھنوی

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس فصل میں مرزا غالب پر ایک فٹ نوٹ دیا گیا ہے۔ دیکھئے فٹ نوٹ نمبر ۲ بر صفحہ ۵۳۔

باب دوم (ص ۵۴ تا ۶۴) میں عربی لسانیات کے ماہرین کے اختیار کیے گئے طریقوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم (ص ۶۵ تا ۷۴) میں داخلی اور خارجی صوتیات پر گفتگو کی گئی ہے۔

باب چہارم (ص ۷۵ تا ۹۲) میں اس بات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے کہ فارسی الفاظ کا داخلہ عرب میں کیسے ہوا، یہاں تک کہ یہ عربی زبان کا حصہ بن گئے۔

ضمیمہ (ص ۹۳ تا ۹۶) الجوالیقی کی ''المعرب'' پر رپورٹوں اور ابتدائی مشاہدات پر مشتمل ہے۔

الفاظ کی فہرست (Index) (ص ۹۷ تا ۱۰۹) میں انگریزی زبان کے الفاظ ہیں جنہیں

لاطینی رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔

عربی ماہرین لسانیات (ص ۱۱۰تا ۱۱۲) کی فہرست میں ۸۶ معروف عربی ماہرین لسانیات کے اسمائے گرامی ہیں۔

مخففات (ص ۱۱۳تا ۱۱۸) میں ۱۳۳ مندرجات ہیں۔

اس مقالہ پر نامور مستشرقین کے انگریزی تبصرے ''جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی'' (۱۹۲۰ء)، ''بمبئی کرانیکل'' (تاریخ نا معلوم) اور ''مسلم ورلڈ'' (۱۹۲۵ء) میں شائع ہوئے۔ جرمن تبصرے ۱۹۲۱ء میں جرمنی میں شائع ہونے والے "Der Islam" اور دو دیگر مجلّات میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ان مجلّات کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ کیونکہ یہ نام خدا بخش پٹنہ کو ہدیہ کیے گئے عکسی نسخہ پر ہاتھ سے لکھے گئے تھے جو پڑھے نہیں جا سکے۔ لیکن یہ تبصرے اس مقالے کی قدر و قیمت پر دال ہیں۔

پروفیسر مقصود صاحب کا خیال ہے کہ افادہ عام کی غرض سے یو۔ جی۔ سی۔ اسکیم کے تحت اس کا ترجمہ انگریزی، عربی، فارسی، اردو نیز دیگر زبانوں میں شائع کیا جانا چاہیے۔

تعلیقات وحواشی

(۱) خان، رشید حسن، ''اردو املا'' دہلی ۱۹۷۴ء ص ۱۴۱۔ (۲) دیکھیے چودھری ضیاء الحق (ڈاکٹر) Linguistic Accomplishments of Dr. Abdus Sattar Siddiqi, in the Collegian (English Section) Annual Magazine of Lucknow Christian College 1998-99 Lucknow p.15. اس کی فوٹو کاپی کے لیے مقصود صاحب نے علی گڑھ کے ڈاکٹر عطا خورشید کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ڈیوٹی ڈیپوٹیشن کا تعلق دراصل ''انجمن الفرض'' (The Duty Society of India) سے تھا جسے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۱۸۶۷ء-۱۹۳۰ء) نے قریوں، قصبات اور شہروں سے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی ترقی کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ بھی ہو سکے۔ (دیکھیے Collegian اردو سکشن ص ۴۔ ''ناموران علی گڑھ''، ص ۲۵، پہلا کارواں جنوری تا ستمبر ۱۹۸۵ء۔ کاروان دوم ۱۹۸۶ء۔ ۹۔ ۷۰۔ (۳) دیکھیے، چودھری ضیاء الحق: ڈاکٹر

عبدالستار صدیقی۔ ہند کے مایہ ناز ماہر لسانیات (Urdu Section) "in the "collegian۔اس مقالہ کی فوٹو کاپی جناب ڈاکٹر اے۔خورشید نے فراہم کی تھی جس کے لیے مقالہ نگار ان کا شکر گزار ہے۔(۴) دیکھیے صدیقی ،عبدالستار (Enno Littmann(16th. September 1875- 4th. May 1958 درمجلّہ ''علوم اسلامیہ''، جون ۱۹۶۰ء (علی گڑھ۔ص ۲۰۳)۔(۵) ایضاً۔(۶) اندریاس کو بہت سے لوگ سب سے بڑا ایرانی جرمن مستشرق سمجھتے ہیں۔گوٹنجن یونیورسٹی میں سالوں تعلیم دینے کے بعد ۱۹۳۰ء میں تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ساسانی شہنشاہ نرسی (۲۹۳۔۳۰۱ء) کے عظیم پائیکولی کتبات کو محفوظ اور ترجمہ کرنے کا کام اسی کا رہین منت ہے۔ یہ پچھلی صدی (انیسویں صدی) کی ساتویں دہائی کی بات ہے جب اندریاس نے تقریباً ایک سال ایران میں قیام کر کے ان کتبات کی تحفیظ و ترجمہ کا کام مکمل کیا۔قدیم و جدید ایران کی زبانوں اور ان کے اسالیب نیز سامی زبانوں کے علم میں ہمعصروں میں کوئی اس کا مدمقابل نہیں تھا۔ طرفان اجزاء کی دریافت سے اس کی صحیح لیاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان مخطوطات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نے اپنا وہ انقلاب انگیز متن مرتب کیا جس کی وجہ سے ہم ''اوستا'' کے مخطوطے کو موجودہ مطبوعہ شکل میں پڑھنے پر قادر ہو سکے ہیں۔اس بنیادی کام کے بعد جس میں اندریاس نے ''اوستا'' کے مختلف مخطوطات کے صوتی آہنگ کو دریافت کیا اس نے ایک اور اہم کام یہ کیا کہ اوستا کے اصل متن کو متعین کیا جسے ارسائی (پارتھین) حکمراں ولخاش (Vologese) I (51-77 A.C.) نے اصل ''اوستا' کی شکل میں محفوظ کیا تھا۔ یہ وہی اصل مخطوطہ ہے جسے بعد میں مروج ''اوستا متن'' کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ Taraporewala : Irach jehangir Sorabji , " Elements of the Science of Languages", Calcutta University 1978 pp. 480-481) . (۷) The "Collegian" (English Sectio) p. 16. (۸) ایضاً۔(۹) دیکھیے "Enno Littmann" درمجلّہ ''علوم اسلامیہ'' علیگڑھ، جون ۱۹۸۰ء ص ۲۱۱۔(۱۰) دیکھیے: ندوی، رضی الاسلام ''المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی''۔ایک تعارف۔در ''خدا بخش جرنل''، نمبر ۱۲۰، جون ۲۰۰۰ء، پٹنہ۔ص ۹۶۔(۱۱) دیکھیے صدیقی، مسلم۔مقالات صدیقی (اول) لکھنؤ، ۱۹۸۳ء p.h. and Bhatnagar, S.K.; History of the M.A.O. College , Aligarh 1969 , quoted۔

ادبیات

تاریخ وفات

سید حامد رئیس دانش گاہ ہمدرد، دہلی نو

جناب رئیس احمد نعمانی

خبرِ مرگِ سیدِ حامد
چون در افواہِ این و آن پیچید

درسرِ برگھای کاغذ نیز
چاپ در روز نامہ ھا گردید

باغمین دل ، بہ خانوادہ او
تعزیت گفت ہرکہ خواند و شنید

زانکہ از باغِ دھر در ہمہ عمر
دستہ دستہ گلِ سعادت چید

سال فوت او ، ازرہِ اعداد
جانب حوزہ زبان دوید

بی سر و پای ''ژاژ'' گفت رئیس
۱۴

''مردِ نیکو بہ دارِ خلد رسید''
۱۴۵۰
۱۴ ـ
۱۴۳۶ ھ

گوشۂ مطالعات فارسی، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ۔

ساقی نامہ

سید امتیاز احمد ماہر (علیگ)

خم کے خم لنڈھ گئے تشنہ لب ہم رہے
اب ادھر بھی نگاہ کرم ساقیا

دیکھ در پہ ترے اس طرح ہم پڑے
خشک ہیں لب تو آنکھیں ہیں نم ساقیا

شور کرتی ہوئی اٹھتی ہیں آندھیاں
بڑھتی جاتی ہیں ہر سمت تاریکیاں

بجھ نہ جائے کہیں شمع محفل تری
گھٹ نہ جائے اجالے کا دم ساقیا

آج حیوانیت کی ردا اُوڑھ کر
سو رہی ہے یہ انسانیت بے خبر

کون دے گا یہاں اب اذانِ سحر
سوگئے پاسبان حرم ساقیا

عزم کامل نہیں جذبۂ دل نہیں
ورنہ اپنے لیے دور منزل نہیں

آج بھی کاروان گذشتہ کے ہیں
راہ منزل میں نقش قدم ساقیا

نام لے کر وفا کا یہ مے خوار سب
جام بھر بھر کے پیتے رہے روز و شب

امتحان محبت کا وقت آیا جب
کھل گیا مے کشوں کا بھرم ساقیا

لاکھ روشن کریں عقل کی شمع ہم
بزم کی تیرگی ہوگی ہرگز نہ کم

میکدہ میں نہ رونق کبھی آئے گی
ہوگا جب تک نہ تیرا کرم ساقیا

قلب مضطر نہیں ، دل پریشان نہیں
جذب ایماں نہیں حب باہم نہیں

جتنی دولت تھی سینہ میں سب لٹ گئی
رہ گیا ہے فقط اپنا دم ساقیا

عقل کے دام میں پھنس کے ہم رہ گئے
مصلحت نے ہماری متاع لوٹ لی

بیڑیاں توڑ کر مصلحت کی بڑھا
کاروان جنوں کا قدم ساقیا

کب سے ہے منتظر تیری محفل میں یہ
ماہر تشنہ کو کر عطا ساقیا

پھر وہ بادہ الست پھر وہ جوش جنوں
پھر وہ سوزِ جگر چشمِ نم ساقیا

محلّہ بارہ دری بہار شریف نالندہ۔

مطبوعات جدیدہ

اسلامی ریاست: از جناب الطاف احمد اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۳۶، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹیڈ، ۴/۲، ۳۰۰۴، سرسید احمد روڈ، دریا گنج نئی دہلی-۲۔

اسلامی قانون یعنی شریعت اور پھر اسلام کے سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی، اخلاقی نظام اور شہریوں کے حقوق و فرائض جیسے موضوعات کا احاطہ کر کے ایک مثالی اسلامی ریاست کی تصویر اس کتاب میں پیش کر دی گئی ہے۔ ریاست و سیاست اسلام پر کتابوں کا ایک سلسلہ ہے۔ جس میں طریق بحث پر زمان و مکان کا اثر دیکھا جا سکتا ہے، تاہم عہد نبویؐ اور دور خلفائے راشدینؓ کے اصول بہرحال اس بحث میں مشترک ہیں اور یہ متنازع بھی نہیں۔ دشواری وہاں پیش آتی ہے جب کوئی اہل نظر یا صاحب درد کسی مکمل اسلامی ریاست کی تمنا کرتا ہے اور پھر مسلمانوں کے باہمی اختلاف و انتشار سے وہ ریاست تو کیا کسی ایسے معاشرہ کے وجود سے بھی آشنا نہیں ہو پاتا۔ معاملہ اس وقت اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے جب ایسے سوال سامنے آتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد دنیا میں اسلامی ریاست قائم کیوں نہ ہوئی؟ بظاہر جواب میں ایسی خاموشی ملتی ہے جو بے چارگی ظاہر کرتی ہے۔ فاضل مصنف نے اس خاموشی کے اندرون میں اترنے کی کوشش کی تو اس کی تہہ سے یہ نکتہ ہاتھ لگا کہ ایک سے زیادہ فقہی مسالک کا وجود اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ پھر ان کو اس دشواری کا بھی احساس ہوا کہ ''اکثر علما اسلامی شریعت کو تدریجاً نافذ کرنے کی بجائے یک بارگی نافذ کرنے کے حامی ہیں خواہ معاشرہ ایمانی اور اخلاقی اعتبار سے اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو، اسی طرح مصنف کے نزدیک کئی اور وجہیں ہیں مثلاً حدود و تعزیرات کا اجرا و نفاذ کہ اگر ان کو صحیح تناظر میں پیش کیا گیا ہوتا تو لوگ اسلامی نظام کے قیام سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔ مصنف نے اسی نقطۂ نظر بلکہ ان ہی سوالات و اشکالات کے پیش نظر صحیح اسلامی ریاست کی تصویر پیش کی ہے اس کے باوجود اسلامی حکومت کے قیام میں اگر مسلسل انتظار کی زحمت برداشت کی جارہی ہے تو اس کی وجہ مصنف کی نظر میں اسلامی نظام کی غیر حکیمانہ تعبیر و تشریح ہے اور اس تعبیر کی تشریح میں انہوں

نے اندھی ماضی پرستی اور عصر حاضر کے احوال وظروف کی عدم رعایت اور قول وفعل کا تضاد، ذہنی و اخلاقی انحطاط اور مسلکی اختلافات وغیرہ کی نشان دہی کی ہے، لیکن ان کو مایوسی اس لیے نہیں کہ شاید رحمت الٰہی جوش میں آئے یا کوئی بلند قامت صاحب ایمان یا دینی تحریک وجود میں آئے اور پھر ایک بار ریاست اسلامی کے قیام سے دل شاد ہوں۔ اصل یہ ہے کہ یہ موضوع نہایت حساس اور سنجیدہ ہے، خصوصاً زمان ومکان کے فاصلے ہر دور میں اس بحث کو نازک تر بناتے رہے۔ اس کا اظہار بھی ہوتا رہا کہ ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوتا ہے جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے۔ ایک طرف تو صاحب نظر علما کا یہ خیال بلکہ یقین ہے کہ اس دنیا میں کتاب ونبوت کے بعد اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت وسلطنت اور دنیا کی سیاست ہے تو دوسری طرف یہ اظہار بھی ہے کہ اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد ہے۔ بلکہ ایک حکومت صالحہ اگر مطلوب ہے تو عرضاً اور صرف اس لیے کہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی ہوسکے۔ ایسے میں اس کتاب کا مطالعہ ایک نتیجہ پر پہنچنے میں معاون ہوسکتا ہے۔ فاضل مصنف کا ایک جدا انداز رد وقدح ہے، اس لیے اختلاف بھی ممکن ہے لیکن ان کے اخلاص میں شک کی بہرحال گنجائش نہیں۔

کلام اقبال، موضوعاتی ترتیب: از جناب ابن غوری، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت مناسب، صفحات ۴۴۷، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: (مکان مولف) ۹۴۶-۳-۱۱، امتیاز ریزیڈنسی، چوراہا نیو ملے پلی حیدرآباد نمبر-۱، اور حیدرآباد دکن کے دوسرے مشہور مکتبے۔

علامہ اقبال کے کلام کی ایک خوبی تو ایسی ظاہر وعیاں ہے کہ معتقد ہو یا منتقد سب کو اس کا اقرار ہے کہ عام ہوں یا خاص، خرد ہوں یا کلاں اور بقول مرتب دوست ہو یا دشمن، تقریر وتحریر میں سب سے زیادہ استعمال شعر اقبال ہی کا کرتا ہے۔ اسی احساس نے مرتب کو آمادہ کیا کہ اشعار کو موضوع کے لحاظ سے یکجا کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھائی سو عنوانات کے تحت ان اشعار کی ایک کہکشاں سجا دی گئی اور آسانی یہ پیدا کی گئی کہ موضوعات یا عنوانوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا یعنی آخرت سے یہود تک ہر اہم موضوع پر بآسانی شعر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ساتھ

ہی حوالہ کے طور پر مجموعہ اشعار کا اشاریہ بھی ہے۔ یہ دلچسپ ہونے کے ساتھ اتنا مفید کام ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی نظر میں یہ اقبالیات میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس رائے سے شاید ہی کوئی اختلاف کر سکے۔ مرتب محترم کی علمی و ادبی زندگی ایک غواص کی مسلسل تگ و دو سے عبارت ہے، اخذ و انتخاب کی غیر معمولی صلاحیت نے ان سے عجب اور مفید نتائج ظاہر کیے۔ قرآن و حدیث، دعاؤں اور فضائل و اخلاق کے شہ پاروں کو وہ نہایت دلکش انداز میں پیش کرتے رہے ہیں، خود کو انہوں نے خادم الحروف سے تعبیر کیا ہے، بہت سے آصف جاہی خطابات کی طرح یہ خطاب بھی انوکھا ہے۔ اغلاط و کتابت کا شکوہ اب مناسب نہیں سمجھا جاتا لیکن پہلا ہی شعر جب ناری کو تورانی میں بدل دے تو گلہ کو گنجائش مل ہی جاتی ہے۔

افکار مجیب: مرتب ڈاکٹر عبداللہ عمار رشادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۴۰۰، قیمت ۳۵۰ روپے، پتہ: مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، رشاد نگر، اعظم گڑھ۔

ماضی قریب میں ہندوستان کے طبقۂ علما میں علم و فکر اور قول و عمل کی وحدت کے لحاظ سے جن کو عام اعتبار و احترام حاصل ہوا ان میں مولانا مجیب اللہ ندوی کی شخصیت بہت نمایاں تھی، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے فیض تربیت اور ندوہ اور دارالمصنّفین کے ماحول نے ان کو قوم و ملت کی رہنمائی کے منصب کے قابل بنا دیا اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی پوری زندگی ملت کی تقویت اور شریعت کی حفاظت کا عنوان بن گئی۔ گو ان کی خدمات پر بہت کچھ لکھا اور کہا گیا، لیکن ضرورت ان کی زندگی کے ایک زیادہ مفصل مطالعہ اور موثر ترجمانی کی تھی، اسی کے پیش نظر ان کے صاحبزادے نے قریب تین سال ہوئے ایک سمینار کا اہتمام کیا اور بجا طور پر اس کے لیے دارالمصنّفین کے کانفرنس ہال کا انتخاب کیا۔ سمینار توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ مولانا مرحوم کی شخصیت، علوم و افکار، تصنیفات و تالیفات کے عنوان سے عمدہ مضامین و مقالات پیش کیے گئے، کلیدی مقالات میں پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر محسن عثمانی اور ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی کی تحریروں کے علاوہ اور بھی مضامین میں مولانا کی زندگی کی مکمل تصویر آ گئی۔ اس طرح یہ مجموعہ مضامین مولانا مرحوم کی سراپا علم و عمل زندگی سے اکتساب فیض کے لیے بہت مفید بن گیا ہے۔ ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب، کثرت میں وحدت کا اظہار:

ڈاکٹر امام اعظم، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ قیمت=/۸۰ روپے

۲-تنبیہ المخلوق: مولوی مجاہد الدین ذاکر بدایونی، ترتیب و تحقیق، صاحب زادہ مولانا فضل رسول محمد عزام قادری، تاج الفحول اکیڈمی، مدرسہ عالیہ قدریہ، محلّہ مولوی بنڈانوں۔

قیمت=/۱۲۰ روپے

۳-دریافت (تحقیقی وتنقیدی مضامین): ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل، فاروقی بک اسٹور، اتوارہ بازار، امراؤتی۔ قیمت=/۱۵۰ روپے

۴-شعرائے مہاراشٹر (ممبئی اور مضافات) جلد اول: خلیق الزماں نصرت، رضوی کتاب گھر، ۴۲۳ مٹیا محل، دلی۔

۵-شعرائے مہاراشٹر (ممبئی اور مضافات) جلد دوم: خلیق الزماں نصرت، رضوی کتاب گھر، ۴۲۳ مٹیا محل، دلی۔ قیمت=/۶۰۰ روپے

۶-کندن پارے (شعری مجموعوں میں عروضی نقطہ نظر سے غزلیات میں): کندن لال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت=/۲۰۰ روپے

۷-گنجینہ معنی کا طلسم (مطالعہ غالب): اسلم پرویز، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔ قیمت=/۱۵۰ روپے

۸-معراج فن (مجموعہ مضامین بر علم عروض): کندن لال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، نزد جامع مسجد، دہلی۔ قیمت=/۳۰۰ روپے

۹-مناظر عاشق ہرگانوی کا لٹریری وژن: ڈاکٹر امام اعظم، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔

قیمت=/۱۰۰ روپے

۱۰-نیلم کی آواز (شعری مجموعہ): ڈاکٹر امام اعظم، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔

قیمت=/۲۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	2200/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	240/-
الغزالی	200/-
المامون	100/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
الکلام	230/-
علم الکلام	180/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	100/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	85/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	100/-
کلیات شبلی (اردو)	180/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی) مرتبہ: سید سلیمان ندوی	100/-
مقالات شبلی دوم (ادبی) //	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) //	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) //	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) //	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) //	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) //	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) //	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول //	150/-
مکاتیب شبلی دوم //	190/-
شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) -PRINT
FEBRUARY 2015 Vol- 195 (2)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org Fax No: 05462 - 265080
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
✆ (Office Mobile) 7607046300 (8.00 A.M. To 1:30 P.M.)

تصانیف و مطبوعات شبلی صدی تقریبات

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)		علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی		ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال		کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)		مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی		علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس		ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	سیرت عائشہ	(ہندی ترجمہ)	علامہ سید سلیمان ندوی	325/-
۸۔	عرب و ہند کے تعلقات	(ہندی ترجمہ)	// //	200/-
۹۔	خطبات مدراس	(ہندی ترجمہ)	// //	125/-
۱۰۔	دین رحمت	(ہندی ترجمہ)	مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۱۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، اول	(ہندی ترجمہ)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	125/-
۱۲۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دوم	(ہندی ترجمہ)	// //	180/-
۱۳۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، سوم	(ہندی ترجمہ)	// //	225/-